

مجلہ عدالتی نظائر



اردو زبان میں عدالتی نظائر کی تلخیص پر مشتمل
آئین و قانون کی دنیا کا پہلا مجلہ

مدیر اعلیٰ

مدثر اقبال

مشیر

سجاد حمید یوسف زئی

سرپرست

محمد ذوالقرنین

مشیر

سلمان احمدان

شمارہ ۲، اکتوبر - دسمبر ۲۰۲۳



"مجلہ عدالتی نظائر" آئین پاکستان اور اسلامی شریعت کی قائم کردہ مثالوں پر یقین رکھتا ہے۔ تاہم اس مجلہ میں شائع ہونے والے تمام افکار اہل قلم شرکاء کی ذاتی رائے ہیں۔ اس مجلہ کا ان سے کئی اتفاق ضروری نہیں۔
مجلہ عدالتی نظائر درج ذیل عدالتوں کے تمام موضوعات کے متعلق فیصلوں کے اردو میں ترجمے / تلخیص کا خیر مقدم کرتی ہے۔

- (1) عدالت عظمیٰ
- (2) وفاقی شرعی عدالت
- (3) عدالت عالیہ اسلام آباد
- (4) عدالت عالیہ پشاور
- (5) عدالت عالیہ لاہور
- (6) عدالت عالیہ بلوچستان
- (7) عدالت عالیہ سندھ
- (8) تمام ضلعی عدالتیں
- (9) مرکزی عدالت گلگت بلتستان
- (10) مرکزی عدالت آزاد جموں و کشمیر
- (11) خصوصی عدالتیں
- (12) وفاقی اور صوبائی محتسب
- (13) بین الاقوامی عدالت انصاف

مجلہ حقوق محفوظ ہے۔ پیشگی تحریری اجازت کے بغیر مجلہ کے کسی حصہ کی کسی بھی قسم کی اشاعت قانونی اور اخلاقی

جرم ہے۔

مجلہ عدالتی نظائر کے اگلے شمارے میں اپنی تلخیص شائع کرنے کے لئے اس میل پر اپنی تحقیق ارسال کرے۔

editor.majala@gmail.com

مجله عدالتی نظائر

اکتوبر-دسمبر ۲۰۲۳ء

مجلس ادارت

سرپرست:	محمد ذوالقرنین، ایڈووکیٹ و ریسرچ	مدیر	مدثر اقبال، طالب علم شعبہ قانون، بین
	افیسر کے۔ پی بار کونسل	اعلیٰ:	الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
مدیر:	محمد قمر الحق، ناظم، جامعہ محمدی	شریک	ریحان اللہ، طالب علم شعبہ شریعہ، بین
	شریف، جینیٹ	مدیر:	الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
نائب مدیر:	عاقب فاروق، طالب علم شعبہ قانون،	شریک	محمد اسد، طالب علم شعبہ شریعہ، بین
	گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور	مدیر ۲:	الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
شریک	افریاب خان، طالب علم شعبہ		
مدیر ۳:	شریہ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی،		
	اسلام آباد		

مجلس مشاورت

سجاد حمید یوسفزئی	سلمان احمدان
ایڈووکیٹ ہائی کورٹ و بانی آئین و قانون	ایڈووکیٹ عدالت عالیہ و بانی قانون دان

فہرست

شمار	عنوان	تلفیض نگار	صفحہ
	ترجمہ / تلفیض نگاران		63
	اداریہ		64
	دیوانی مقدمات		
33	آئین پاکستان کے آرٹیکل انیس - اسے یعنی معلومات تک رسائی کے تحت سپریم کورٹ کے ملازمین کی تفصیلات فراہم کرنے کے حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک اہم فیصلہ	محمد ذوالقرنین	65
34	انکم ٹیکس آرڈیننس کے سیکشن ۷ - ای پراہو رہائی کورٹ کے جسٹس شاہد جمیل خان کا اہم فیصلہ	محمد اسد	69
35	سپریم کورٹ میں دوسری نظر ثانی قابل سماعت کے حوالے سے، از خود نظر ثانی کے دائرہ اختیار اور کیوریٹیو ریو کے تصور کے حوالے سے فیصلہ	کامران علی چنے	77
36	پردہ نشین / ان پڑھ خواتین کے ساتھ قانونی طور پر لین دین کرنے کے شرائط کے حوالے سے سپریم کورٹ کا فیصلہ	محمد عارف شیر	80
37	صوبائی قوانین کی تشریح متعلقہ صوبے کی ہائی کورٹ کر سکتی ہے۔ کسی اور صوبے کی ہائی کورٹ یا اسلام آباد ہائی کورٹ ان کی تشریح نہیں کر سکتی، اس حوالے سے سپریم کورٹ کا عمدہ فیصلہ	طاہر خان وزیر	82
38	ضابطہ دیوانی کی دفعہ ۱۰۰ کے تحت دوسری ایپل پر سپریم کورٹ کا ایک اہم فیصلہ	عاقب فاروق	84
39	تنازعات کے غیر رسمی حل { اسے ڈی۔ آر } میں فریقین کی رضامندی اور حکم امتناعی کے حوالے سے عدالت عالیہ پشاور کا ایک اہم فیصلہ	احتشام الحق	85
40	سپریم کورٹ کا "ٹریڈ مارک" کی رجسٹریشن میں لفظ "طیمنان" کی تشریح اور مباحث کے معاملات میں کسی چیز کو باقاعدہ طریقہ کار کے مطابق کرنے کے حوالے سے اہم فیصلہ	علیشہ انجم	88

- 41 قرار داد مقاصد، اقتدار اعلیٰ، بنیادی آئینی ساخت، عدلیہ، مقصد کے مابین اختیارات کی تقسیم اور آجپی تعلق کے حوالے سے مشہور ضیاء الرحمن کیس
- 90 محمد اسد
- 42 دیوبانی مقدمات میں ڈی این اے ٹیسٹ سے متعلق سپریم کورٹ کا اہم فیصلہ
- 98 خالد عباس

فوجداری مقدمات

- 43 انسداد و ہتھیگر دی ایکٹ کے تحت نامزد جوینا سائل ملزم کے ٹرائل کے حوالے سے عدالت عالیہ پشاور کا ایک اہم فیصلہ
- 100 محمد ذوالقرنین
- 44 فوجداری مقدمات میں متنبخ ضمانت کے حوالے سے پشاور عدالت عالیہ کا ایک اہم فیصلہ
- 102 محمد ذوالقرنین
- 45 مجموعہ تعزیرات پاکستان کے تحت کسی کوریاست کے خلاف سازش اور بغاوت جیسے مقدمات میں نامزد کرنے کے طریقہ کار کے حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک اہم فیصلہ
- 104 محمد ذوالقرنین
- 46 ملزم کی جانب سے آلہ قتل کی برآمدگی کا باعث بننے والے اعترافی بیان کی قانونی حیثیت کے حوالے سے پشاور ہائی کورٹ کا ایک اہم فیصلہ
- 108 طاہر خان وزیر
- 47 سیاسی پناہ یعنی اسلکم کی غرض سے اپنی جان بچانے کی خاطر غیر قانونی طور پر پاکستان میں داخل ہونے والے افراد کے حوالے سے اسلام آباد ہائی کورٹ کا ایک اہم فیصلہ
- 111 محمد ذوالقرنین
- 48 پشاور ہائی کورٹ کا ۱۳-ایم۔ پی۔ او کے تحت گرفتار سیاسی کارکنان کے کیس میں ۳ ایم۔ پی۔ او اور آئین پاکستان کے آرٹیکل ۲۳۵ کے اہمیت کے حوالے سے اہم فیصلہ
- 113 طاہر خان وزیر
- 49 محکمہ انضباطی/تادہی کارروائی کے تحت پولیس اہلکاروں کی ملازمت سے برطرفی کے حوالے سے سپریم کورٹ کا انتہائی اہم فیصلہ
- 117 اویس خان
- 50 ایک ہی وقت سے متعلق ایک سے زائد ایف آئی آر درج کروانے کے معاملے پر سپریم کورٹ کا اہم فیصلہ
- 118 افراسیاب خان
- 51 توہین رسالت کے حوالے سے سیشن کورٹ کا فیصلہ
- 121 سجاد حمید یوسفزئی

- 52 سپریم کورٹ کا پہلی درخواست ضمانت کے خارج ہونے کے باوجود ٹرائل کی تکمیل میں ایک سالہ تاخیر کو دوسری درخواست ضمانت کے لیے دوبارہ نئی بنیاد تصور کرنے کے حوالے سے اہم فیصلہ
- 124 حمزہ خان
- 53 قانوناً بری ہونا " اور " باعزت بری ہونا " کی یکسانیت اور سرکاری ملازم کی ملازمت پان دونوں کا اثر کے حوالے سے سپریم کورٹ کا فیصلہ
- 127 وقاص علی خان

عالمی مقدمات

- 54 خلع کے حوالے سے وفاقی شرعی عدالت کا ایک اہم فیصلہ
- 129 محمد ذوالقرنین
- 55 اگر خاندان کے حق میں حقوق زن اشوکی کا فیصلہ ہوا ہو، تو کیا بیوی دوسرا دعویٰ برائے تفتیح نکاح دائر کر سکتی ہے؟
- 131 زوالفقار علی
- 56 عدالت عالیہ کی عالمی مقدمات میں دائرہ اختیار کے حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک اہم فیصلہ
- 133 محمد ذوالقرنین
- 57 طلاق اور خلع واقع ہونے کے اثرات اور حلالہ کے حوالے سے وفاقی شرعی عدالت کا ایک اہم فیصلہ
- 135 محمد ذوالقرنین
- 58 پشاور ہائی کورٹ کا تفتیح نکاح کے مقدمات میں راضی نامہ یعنی قبل از راسات مصالحت کی ناکامی کے فوراً بعد تفتیح نکاح کی ڈگری جاری کرنے کے حوالے سے ایک نہایت ہی اہم فیصلہ
- 138 حمزہ خان
- 59 بچوں کے حضانت (کسٹڈی) سے متعلق پاکستان کی عدالت عظمیٰ کا ایک دلچسپ فیصلہ
- 140 مشرف حسین فاجو
- 142 ڈاکٹر عزیز الرحمن
- کاپی رائٹ، مورل رائٹ، پلیسجر ازوم اور آرٹیفیشیل انٹیلی جنس کا چیلنج

ترجمہ / تلخیص نگارانی

محمد ذوالقرنین

ایڈوکیٹ و ریسرچ آفیسر خیبر پختونخوا، ہارکو نسل

محمد اسد

طالب علم، شریعہ اینڈ لاء، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

کامران علی چنے

ایل۔ ایل۔ بی، شہید ذوالفقار علی بھٹو یونیورسٹی آف لاء، کراچی

محمد عارف شیر

ایل۔ ایل۔ بی، شریعہ اینڈ لاء، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

طاہر خان وزیر

ایڈوکیٹ و ممبر آئین و قانون

عاقب فاروق

طالب علم شعبہ قانون، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

علیشا انجم

طالب علم، شعبہ قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

خالد عباس

طالب علم، شریعہ اینڈ لاء، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

اویس خان

شریعیہ اینڈ لاء و ممبر آئین و قانون

افراسیاب خان

طالب علم، شریعہ اینڈ لاء، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

سجاد حمید پوسزئی

ایڈوکیٹ ہائی کورٹ

حمزہ خان

ایڈوکیٹ، ڈسٹرکٹ کورٹس، تمبرگرہ

وقاص علی خان

ایڈوکیٹ، درگئی بار ایسوسی ایشن، ملاکنڈ

مشفق حسین ناچو

طالب علم، شریعہ اینڈ لاء، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

اداریہ

ایک وکیل کی بنیادی خصوصیت سچائی کی تلاش کے ساتھ ساتھ ثبوت کی فراہمی ہے اور یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ وسیع اور عمیق مطالعے کے بغیر سچائی کی تلاش اور ثبوت کا حصول ایک سعی لاحاصل کے سوا کچھ نہیں اور اس بات میں بھی کوئی دورائے نہیں کہ مطالعہ کے بغیر کسی بھی شعبہ میں اوج کمال تک پہنچانا ممکن ہے جبکہ شعبہ قانون اور بالخصوص وکالت میں مطالعے کی ضرورت باقی تمام شعبہ ہائے زندگی سے کہیں زیادہ ہے اور مطالعے میں بھی بالخصوص عدالتی نظائر کا مطالعہ شعبہ قانون سے تعلق رکھنے والے ہر فرد کے لئے بالکل لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ عدالتی نظائر کی اسی اہمیت کے پیش نظر القرضی لائبریری سلیس، آئین و قانون اور قانون دان نے جولائی ۲۰۲۳ء سے پاکستان کی آئینی و قانونی تاریخ میں پہلی مرتبہ سہ ماہی بنیاد پر سلیس اور آسان اردو میں عدالتی نظائر کی تلخیص پر مشتمل مجلہ عدالتی نظائر کی اشاعت کا آغاز کیا ہے۔ یاد رہے کہ مجلہ عدالتی نظائر اس طویل المدت سوچ کی پہلی سیڑھی ہے جس میں بالخصوص شعبہ قانون سے تعلق رکھنے والے احباب اور بالعموم عام عوام کی تمام ضروریات پر مشتمل قومی زبان اردو میں ایک مجلہ ہو۔ امید واثق ہے کہ مجلہ عدالتی نظائر کا علمی و ادبی معیار بہت جلد ملک پاکستان کے ممتاز مجلوں میں شمار ہوگا۔

آئین پاکستان کے آرٹیکل انہیں - اے یعنی معلومات تک رسائی کے تحت سپریم کورٹ کے ملازمین کی تفصیلات فراہم کرنے کے حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک اہم فیصلہ

محمد ذوالقرنین ایڈووکیٹ¹

حقائق:

مختار احمد علی نامی ایک شہری نے ۱۰ اپریل ۲۰۱۹ کو رجسٹرار سپریم کورٹ کے نام ایک خط لکھا جس میں ان سے مندرجہ ذیل معلومات فراہم کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

1. سپریم کورٹ میں مختلف عہدوں پر تعینات گریڈ ا سے لے کر گریڈ ۲۲ تک کے تمام منظور شدہ ملازمین کی تفصیلات۔
2. سپریم کورٹ میں تعیناتی کے منتظر تمام عہدوں کی تفصیلات کچھ اس طرح سے کہ وہ کب سے خالی ہیں۔
3. سپریم کورٹ کے غیر مستقل ملازمین یعنی یومیہ اجرت پر کام کرنے والے اور طویل المدتی اور مختصر عرصے کے لیے کنٹریکٹ پر کام کرنے والے ملازمین کی تفصیلات۔
4. یکم جنوری ۲۰۱۷ کے بعد سپریم کورٹ میں کتنے نئے عہدے اور کس قسم کے عہدے تخلیق کئے گئے کی تفصیلات۔
5. سپریم کورٹ میں ملازمت سرانجام دینے والی خواتین کی گریڈ کے حساب سے تفصیلات کچھ اس طرح کہ کیا وہ مستقل، غیر مستقل یا عارضی طور پر تعینات ہیں۔
6. سپریم کورٹ میں ملازمت سرانجام دینے والے معزور افراد کی گریڈ کے حساب سے تفصیلات کچھ اس طرح کہ کیا وہ مستقل، غیر مستقل یا عارضی طور پر تعینات ہیں۔
7. سپریم کورٹ میں ملازمت سرانجام دینے والے خواجہ سرا ملازمین کی تفصیلات گریڈ کے حساب سے کچھ اس طرح کہ کیا وہ مستقل، غیر مستقل یا عارضی طور پر تعینات ہیں۔
8. سپریم کورٹ کے منظور شدہ سروس رولز کی تصدیق شدہ کاپی۔

¹ ریسرچ آفیسر؛ خیبر پختونخوا ہار کونسل، پشاور

سپریم کورٹ کے رجسٹرار سے مندرجہ بالا معلومات نہ ملنے کی وجہ سے درخواست گزار مختار احمد علی نے ۶ مئی ۲۰۱۹ کو پاکستان انفارمیشن ایکٹ کے دفعہ ۷ ا کی رو سے پاکستان انفارمیشن کمیشن میں اپیل جمع کی جس کے بعد پاکستان انفارمیشن کمیشن نے رجسٹرار کو لکھا کہ سپریم کورٹ میں پبلک ریلیشنز آفیسر کے عہدے پر کسی کو نامزد کیا جائے تاکہ وہ درخواست گزار کو اس کے مطلوبہ معلومات فراہم کر سکے لیکن رجسٹرار سپریم کورٹ کی جانب سے اس کا جواب بھی نہیں دیا گیا جس کے بعد پاکستان انفارمیشن کمیشن نے بالترتیب ۱۶ اور ۲۶ جولائی ۲۰۱۹ کو یاد دہانی کے لئے لکھا جس کے بعد بالآخر ۱۸ اگست ۲۰۱۹ کو رجسٹرار نے صراحتاً سپریم کورٹ کے ایک نوٹیفکیشن کو بنیاد بنا کر مندرجہ بالا معلومات دینے سے انکار کر دیا جس کے خلاف درخواست گزار نے پاکستان انفارمیشن ایکٹ کے دفعہ ۷ کو استعمال میں لاتے ہوئے اپیل دائر کی جو کہ چیف انفارمیشن کمیشن اور دو انفارمیشن کمیشنرز کے سامنے سماعت کے لیے مقرر ہوا اور بالآخر ۱۲ جولائی ۲۰۲۱ کو کمیشن نے درخواست گزار کی اپیل منظور کرتے ہوئے رجسٹرار سپریم کورٹ کو حکم دیا کہ وہ درخواست گزار کو مطلوبہ معلومات فراہم کرے۔ کمیشن کے مندرجہ بالا فیصلے کے بعد اس وقت کے رجسٹرار سپریم کورٹ جناب جواد پال نے پاکستان انفارمیشن کمیشن کو ایک درخواست دی جس میں انہوں نے یہ استدعا کی کہ کمیشن اپنا ۱۲ جولائی والا فیصلہ واپس لے لیکن کمیشن نے فریقین یعنی مختار احمد علی اور رجسٹرار سپریم کورٹ کو سننے کے بعد رجسٹرار صاحب کی درخواست ۷ نومبر ۲۰۱۷ کو اس وجہ سے خارج کی کہ مروجہ ایکٹ کے مطابق فیصلہ واپس لینا کمیشن کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔

پاکستان انفارمیشن کمیشن کے دونوں فیصلے خلاف آنے کے بعد تب کے چیف جسٹس سپریم کورٹ جناب گلزار احمد نے ایڈیشنل انٹرنی جنرل کو مندرجہ بالا دونوں فیصلے اسلام آباد ہائی کورٹ میں آئینی درخواست کے ذریعے چیلنج کرنے کا کہا جس کے بعد بالآخر اسلام آباد ہائی کورٹ نے ۳ اپریل ۲۰۲۳ کو رجسٹرار سپریم کورٹ کی آئینی درخواست کو منظور کرتے ہوئے کمیشن کے دونوں فیصلوں یعنی ۱۲ جولائی ۲۰۲۱ اور ۷ نومبر ۲۰۲۱ والے فیصلوں کو اس وجہ سے کالعدم قرار دے دیا کہ چونکہ سپریم کورٹ "پبلک باڈی" کی زمرے میں نہیں آتی اور بدیں وجہ سپریم کورٹ پاکستان انفارمیشن کمیشن کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ اسلام عدالت عالیہ کے مندرجہ بالا فیصلے کے خلاف درخواست گزار مختار احمد علی نے لاء ریفرار مزار ڈیننس کے دفعہ ۳ کو استعمال میں لاتے ہوئے انٹر کورٹ اپیل دائر کی جو کہ اسلام آباد ہائی کورٹ نے تاخیر سے جمع کرانے کی وجہ سے میعاد سماعت ختم ہونے کی بناء پر مسترد کر دی۔ جس کے بعد درخواست گزار سپریم کورٹ سے رجوع کرتا ہے اور یوں اس اہم کیس کا آغاز سپریم کورٹ میں ہو جاتا ہے۔

سپریم کورٹ میں درخواست گزار یہ نکتہ اٹھاتا ہے کہ چونکہ وہ پاکستان کا شہری ہے اور آئین پاکستان کا آرٹیکل ۱۹- اے اسے یہ بنیادی حق فراہم کرتا ہے کہ اس کو اس کے مطلوبہ معلومات فراہم کی جائیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے اس حق کے لیے پاکستان انفارمیشن ایکٹ پر بھی انحصار کرتا ہے۔ درخواست گزار یہاں پر یہ نکتہ بھی بیان کرتے ہیں کہ آئین پاکستان کے آرٹیکل انیس- اے کا اطلاق سپریم کورٹ پر بھی ہوتا ہے اور یہ بھی عرض کیا کہ وہ جو معلومات فراہم کرنے کی درخواست کر رہا ہے تو نہ تو وہ حساس معلومات ہیں اور نہ ہی وہ ایسی معلومات ہیں کہ - جن کو خفیہ رکھنا ضروری ہو۔ اسلام آباد ہائی کورٹ کے فیصلے کی بابت درخواست گزار یہ جواب دیتے ہیں کہ کمیشن کے فیصلوں کو اسلام آباد ہائی کورٹ نے آئین پاکستان کے آرٹیکل ۱۹- اے کو درخور اعتنائہ سمجھتے ہوئے صرف تکنیکی بنیادوں پر خارج کر دیا۔ انٹرا کورٹ اپیل تاخیر سے جمع کرانے کے سوال پر درخواست گزار کا موقف یہ تھا کہ چونکہ درخواست گزار وکیل نہیں ہے اور اس کو فیصلے سے آگاہ ہی نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس کو فیصلے کا پتہ سوشل میڈیا سے چلا۔

سپریم کورٹ نے اپنے دلائل کا آغاز رجسٹرار کی جانب سے سپریم کورٹ کے نام پر قانونی چارہ جوئی سے کیا ہے اور اس بابت سپریم کورٹ رولز ۱۹۸۰ میں ذکر کردہ رجسٹرار کے اختیارات سے کیا ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ رولز میں کہیں پر بھی قانونی چارہ جوئی کے آغاز کے متعلق ذکر نہیں ہے لیکن ساتھ ہی یہ لکھا ہے کہ رجسٹرار کو یہ اختیار نہیں سونپا جاسکتا اور نہ ہی وہ یہ ذمہ داری لے سکتے ہیں کیونکہ آئین پاکستان کے مطابق سپریم کورٹ سے مراد چیف جسٹس اور سپریم کورٹ کے ججز ہیں لیکن اس کے باوجود قانونی چارہ جوئی کا آغاز سپریم کورٹ سے منظور کی بغیر رجسٹرار صاحب نے کیا۔ یہاں پر چیف جسٹس قاضی فائز عیسیٰ نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ چونکہ اس وقت کے رجسٹرار بنیادی طور پر ایک بیورو کریٹ تھے تو ان کو شاید رولز کا علم نہ تھا۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے یہاں پر ایک اور قضیے کا بھی نہایت ہی خوبصورت تصفیہ کیا ہے اور اس فیصلے کی تلخیص لکھنے میں اس جیہا رگراف کا اہم کردار ہے۔ چیف جسٹس صاحب لکھتے ہیں کہ سپریم کورٹ کی نمائندگی اسلام آباد ہائی کورٹ میں ایڈیشنل انٹرنی جنرل نے کی جو کہ بنیادی طور پر وفاقی حکومت کے نمائندے ہوتے ہیں اور انتظامیہ سے تعلق رکھتے ہیں جس کو عدلیہ سے الگ رکھنا آئینی طور پر ضروری ہے اور چونکہ اس کیس کا وفاقی حکومت سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ یہ خالصتاً سپریم کورٹ کا مسئلہ تھا۔ یاد رہے کہ رجسٹرار کی جانب سے قانونی چارہ جوئی کے آغاز والا معاملہ اسلام آباد ہائی کورٹ میں

بھی زیر بحث آیا تھا لیکن اسلام آباد ہائی پراخصصار کرتے ہوئے اس کیس کورٹ نے سپریم کورٹ کے مختلف فیصلوں² کو قابل سماعت قرار دیا تھا۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے مندرجہ بالا دونوں فیصلوں کا مختصر اجازہ لے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ ان دونوں کیسیز کا اطلاق کسی صورت موجودہ کیس پر نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے بعد چونکہ انٹرنی جرنل صاحب نے یہ دلائل دئے کہ پاکستان انفارمیشن کمیشن ایکٹ کا اطلاق سپریم کورٹ پر نہیں ہوتا کہ ساتھ اتفاق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس ایکٹ کا اطلاق سپریم کورٹ پر نہیں ہوتا اور اس حد تک اسلام آباد ہائی می کورٹ کو فیصلہ بھی درست قرار دیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ لکھا ہے کہ یہ کہانی یہاں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کے بعد اس اصل نکتے کا رخ کیا ہے کہ کیا آئین پاکستان کے آرٹیکل انیس - اے کے تحت درخواست گزار کو مطلوبہ معلومات فراہم کی جاسکتی ہیں یا نہیں؟

فیصلے کے مطابق سپریم کورٹ آئین پاکستان کے آرٹیکل انیس - اے کے دائرہ کار سے باہر نہیں ہے اور "عوامی اہمیت" کا درجہ رکھنے والی معلومات سپریم کورٹ سے مانگی جاسکتی ہیں۔ اس کے بعد جسٹس قاضی فائز عیسیٰ نے عوامی اہمیت" کے موضوع پر نہایت ہی خوبصورت بحث باندھی ہے اور اس ضمن میں سپریم کورٹ کے کئے فیصلوں کا ذکر کیا ہے اور اس کے بعد اس فیصلے کا سب سے بہترین پیرا گراف لکھا ہے جو کہ خود پڑھنے اور دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے بعد ایک اور خوبصورت بحث عوام کا معلومات کی رسائی پر باندھا ہے اور اس ضمن میں مختلف ملکی اور غیر ملکی فیصلوں کا حوالہ دینے کے بعد حضرت عمر فاروق رض کے چادر والے واقعے کا ذکر بھی کیا ہے۔ فیصلے کے آخر میں چیف جسٹس قاضی فائز عیسیٰ صاحب نے لکھا ہے کہ مختلف صورتوں میں معلومات تک رسائی نہیں بھی دی جاسکتی لیکن معلومات نہ دینے کی صورت میں صراحت کے ساتھ اس کے وجوہات کا ذکر کیا جائے گا اور چونکہ اس کیس میں ایسی کوئی وجہ نہیں کہ جس کی وجہ سے درخواست گزار کو اس کی مطلوبہ معلومات فراہم نہ کی جائیں تو اس وجہ سے سپریم کورٹ نے رجسٹرار سپریم کورٹ کو حکم دیا ہے کہ سات دنوں کے اندر اندر درخواست گزار کو اس کی مطلوبہ معلومات فراہم کی جائیں اور ساتھ ہی عدالت نے درخواست گزار کو اس کی کورٹ فیس بھی واپس دینے کا حکم صادر کیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات واضح الفاظ میں لکھی ہے کہ چونکہ یہ کیس اس نوعیت کا پہلا کیس ہے تو اس کو اردو زبان میں بھی ترجمہ کیا جائے لیکن عدالتی نظیر کی حیثیت انگریزی زبان والے فیصلے کو حاصل ہوگی۔

² ۱۹۸۷ء، سی، آر، جے، ۱۱۹۹ء، ایس، ای، ایم، آر، ۱۴۱

نوٹ: اس کیس میں سپریم کورٹ کا چیف جسٹس قاضی فائز عیسیٰ صاحب، جسٹس امین الدین خان اور جسٹس اطہر من اللہ صاحب پر مشتمل تھالیکن متفقہ فیصلہ جسٹس قاضی فائز عیسیٰ صاحب نے لکھا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ جسٹس اطہر من اللہ صاحب نے چیف جسٹس قاضی فائز عیسیٰ صاحب کے دلائل کو مزید تقویت دینے کے لیے ایک الگ نوٹ بھی لکھا ہے۔

انکم ٹیکس آرڈیننس کے سیکشن ۷- ای پر لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس شاہد جمیل خان کا اہم فیصلہ³

محمد اسد⁴

حقائق:

انکم ٹیکس آرڈیننس ۲۰۰۱ کے دفعہ ۷- ای میں بنیادی طور پر 'مفروضہ قانونی'⁵ کا استعمال کر کے یہ قرار دیا گیا ہے کہ پاکستان کا رہائشی شخص، اگر پاکستان میں موجود کسی ایسی غیر منقولہ جائیداد/ اثاثہ جیسے کوئی پلاٹ/ گھر وغیرہ کا مالک ہے جسکی نہ صرف قیمت ڈھائی کروڑ سے زائد ہو بلکہ وہ نہ زراعت اور کاروبار کیلئے استعمال میں ہو، اور نہ ہی وہ اسکی واحد جائیداد ہو تو ایسی صورت حال میں یہ فرض کیا جائے گا کہ اس رہائشی شخص نے اس جائیداد/ اثاثے کی اصل مارکیٹ قیمت کے پانچ فیصد کے برابر سالانہ انکم/ نفع کمایا ہے اور اس ۵ فیصد فرضی آمدنی پر دفاق ۲۰ فیصد انکم ٹیکس وصول کرے گا۔ چاہے اس پلاٹ یا گھر سے آپ کچھ نہ کما رہے ہوں اور وہ خالی پڑا ہو۔ اسکے علاوہ جائیداد کی مارکیٹ قیمت بڑھنے پر ہر سال اس ٹیکس کی رقم بھی بڑھتی جائے گی۔

آئن سٹائن کے بقول چونکہ "دنیا میں سب مشکل کام انکم ٹیکس کو سمجھنا ہے"، تو ہم اس کیس کو بہتر انداز میں سمجھنے کیلئے، کچھ بنیادی تصورات کو بھی مختصر اذکھ لیتے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ انکم ٹیکس آرڈیننس کی دفعہ ۸۰ کے مطابق شخص سے مراد محض انسان نہیں بلکہ اس میں کاروباری ادارے بھی شامل ہیں۔ اسکے علاوہ مفروضہ قانونی سے مراد قانون کا کسی مقصد کے حصول کیلئے کسی ایسی صورت حال، چیز یا واقعہ کو درست یا حقیقت تسلیم کرنا جو کہ اصل میں سچ نہ ہو یا وجود نہ رکھتے ہوں۔ جیسے کمپنی، جو کہ اصل میں تو شخص کی تعریف میں شامل نہیں لیکن

³ رٹ پیٹیشن نمبر ۵۲۵۵۹ آف ۲۰۲۲

⁴ طالب علم سمسٹر نم، شریعہ اینڈ لاء، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

⁵ Legal Fiction: An assumption that something is true even though it may be untrue made esp.

ٹیکس اور دوسرے قانونی امور و مقاصد کے حصول کیلئے اسکو ہم ایک شخص تصور کرتے ہیں، اسی طرح لے پالک بچے کو ان گود لینے والوں کا طبیعتی بچہ تسلیم کرنا یاد فہمے۔ ای میں غیر موجود اکم کو فرض کرنا مفروضہ قانونی کی مثالیں ہیں۔ جبکہ 'اصل مارکیٹ قیمت' اوپن مارکیٹ میں کسی اثاثے کی متوقع قیمت فرخت کو کہتے ہیں۔ اور وفاقی قانون سازی کی فہرست سے مراد آئین کے چوتھے شیڈول میں دی گئی وہ فہرست جس کے مختلف کالموں میں ان معاملات اور چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کے متعلق وفاقی پارلیمان قانون سازی کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔

فریقین کے دلائل:

مذکورہ دفعہ کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں ۱۰۰۰ سے زائد آئینی درخواستیں داخل کی گئی تھی، جس کے حق اور مخالفت میں کئی وکلاء نے دلائل دیے لیکن ہم صرف عدالتی فیصلے سے متعلقہ دلائل کی مناسب تشریح کیساتھ ذکر کریں گے۔

مدعیان کی طرف سے سلمان اکرم راجا کا یہ موقف تھا کہ، اٹھارویں ترمیم کے نتیجے میں، ترمیم شدہ انٹری نمبر ۵۰ کے مطابق غیر منقولہ جائیداد سے متعلق کسی بھی قسم کے ٹیکس لگانے کا اختیار وفاقی پارلیمان کے دائرہ اختیار سے نکال دیا گیا ہے، اس لیے انٹری نمبر ۴۷، جو کہ وفاقی اکم ٹیکس لگانے کا اختیار دیتا ہے، کو استعمال کرتے ہوئے وفاقی پارلیمان غیر منقولہ جائیداد سے متعلق اکم ٹیکس نہیں لگا سکتی۔ مزید یہ کہ انٹری ۵۰، جو وفاق کو اثاثوں کی مالیتی قدر پر ٹیکس لگانے کا اختیار دیتا ہے، میں غیر منقولہ جائیداد پر ٹیکس نہ لگانے کے جملے کا بنیادی مقصد غیر منقولہ جائیداد پر ٹیکس لگانے کی ممانعت واضح کرنا نہیں، بلکہ اصل مقصد غیر منقولہ جائیداد کو سرے سے اثاثوں کی تعریف سے بیدخل کرنا ہے، اس دلیل کو بہتر انداز میں سمجھنے کی خاطر ہم انٹری نمبر ۵۰ کی اٹھارویں ترمیم کے بعد کی حالت دیکھتے ہیں۔

فاضل وکیل کے مطابق چونکہ اٹھارویں آئینی ترمیم کے نتیجے میں کی جانے باقی مختلف ترمیم کے ذریعے غیر منقولہ جائیداد پر ٹیکس لگانے کا اختیار پہلے ہی صوبائی حکومتوں کے حوالے کر دیا گیا تھا، لیکن انٹری ۵۰ میں اثاثوں کی مالیتی قدر پر ٹیکس نافذ کرنے کا اختیار وفاقی پارلیمان کو دینے کے فوری بعد "غیر منقولہ جائیداد پر ٹیکس اس میں شامل نہیں" کے جملے کے ذریعے غیر منقولہ جائیداد کو اثاثے کی تعریف سے ہی بے دخل کر دیا گیا ہے، حالانکہ

⁶ انٹری 50: اثاثوں کی کیپٹل ویلیو پر ٹیکس، غیر منقولہ جائیداد پر ٹیکس شامل نہیں۔

غیر منقولہ جائیداد کو عام طور پر تو اثاثوں کا ہی حصہ تصور کیا جاتا ہے، اس دلیل کی اہمیت اور وجہ عدالتی فیصلے میں جا کروا نضح ہوگی۔

اس کے علاوہ ان کا موقف تھا کہ پارلیمنٹ کو دیالیا گیا مفروضہ قانونی کے استعمال کا حق مادر پدر آزاد نہیں بلکہ اس پر کچھ بندشیں بھی ہیں اور اپنے اس موقف کے حق میں فاضل وکیل نے عدالت کا ایک فیصلہ 7 پیش کیا جس میں قرار دیا گیا تھا کہ پارلیمنٹ کسی ایسی چیز کو آمدن قرار نہیں دے سکتا جس کو عقلی طور پر کسی شہری کی آمدن تسلیم ہی نہ کیا جاسکے، نہ ہی کسی انٹری کی تشریح کرتے وقت اس کی معانی کو ممکن حد تک وسعت دینے کے اصول پر عملدرآمد کی کوشش میں آئین میں وفاقی اور صوبائی پارلیمنٹوں کے درمیان کی گئی قانون سازی کے اختیار کی تقسیم کو تبدیل کیا جائے۔ مزید فرمایا کہ [ڈاکٹر ائن آف پتھ اینڈ سبسٹانس]⁸ کا استعمال کر کے وفاقی پارلیمنٹ کو اپنے اختیار قانون سازی کی حدود سے تجاوز کرنے کے عمل سے روکا جائے۔ یاد رہے کہ وفاقی طرز پر بنائی گئی ریاستوں جہاں وفاقی اور صوبائی ریاستی کے درمیان مختلف معاملات پر قانون سازی کرنے کا اختیار تقسیم ہوا ہوتا ہے، تو وہاں جب کسی ایک پارلیمنٹ کے بنائے گئے قانون پر اس بنیاد پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ قانون کسی ایسے معاملے سے متعلق ہے جو اس کے بنانے والے قانون ساز ادارے کی حدود سے باہر ہے تو ایسے دعویٰ یا اعتراض کو جانچنے کیلئے اس ڈاکٹر ائن کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس ڈاکٹر ائن کی رو سے کسی بنائے گئے قانون کے بنیادی جوہر کو دیکھا جاتا ہے کہ کیا وہ قانون بنیادی طور پر کسی ایسے معاملے سے متعلق ہے جو اس قانون ساز ادارے کے حدود سے باہر ہے یا محض وہ بالواسطہ کسی ایسے معاملے پر اثر انداز ہو رہا ہے جو اس قانون ساز ادارے کی حدود سے تو باہر ہے لیکن اس اس کے بالواسطہ اثر سے فرار ممکن نہیں۔ یہاں سلمان اکرم راجا صاحب کا موقف تھا کہ وفاقی پارلیمنٹ نے دفعہ ۷-اے کی ذریعے ایک ایسے معاملے یعنی غیر منقولہ جائیداد پر انکم ٹیکس لگانے کی کوشش کی ہے جو کہ اس کے اختیار سے ہی باہر تھا اور مذکورہ ڈاکٹر ائن کی رو سے اس قانون کو کالعدم قرار دیا جانا چاہیے۔ انہوں نے درج ذیل عدالتی نظائر⁹ کو اپنے اس موقف کے حق میں پیش کیا۔

7 پی ایل ڈی ۱۹۹۷ سپریم کورٹ ۵۸۲۔

⁸ Doctrine of pith and substance

⁹ پی ایل ڈی ۲۰۰۶ سپریم کورٹ ۶۰۲، ۱۸۸۶، ۱۱۸۸، سی، ایم، آر ۲۰۲۲

مزید انہوں نے دفعہ ۷- ای کے اس ٹیکس سے مختلف لوگوں کو دی گئی استثنیٰ کو آئین کے آرٹیکل ۲۵، جو کہ تمام شہریوں سے یکساں سلوک کی ہدایت دیتا ہے، کی بنیاد پر چیلنج کیا، اور اپنے اس موقف کے حق میں عدالت کے فیصلوں¹⁰ کو پیش کیا۔

مدعیان علیہ کی طرف سے ایف۔ بی۔ آر کے وکیل ایڈوکیٹ خالد اسحاق نے یہ موقف اپنایا کہ وفاقی پارلیمان دفعہ ۷- ای میں موجود غیر منقولہ جائیداد سے حاصل ہونے والی فرضی آمدن پر ٹیکس لگانے کیلئے قانون سازی کا اختیار، آئین میں موجود وفاقی قانون سازی کی لسٹ کی انٹری نمبر ۷۴ سے اخذ کرتا ہے۔ اور اوپر ذکر کردہ وفاقی قانون سازی کی لسٹ کے وسیع تشریح کے اصول کا سہارا لیتے ہوئے یہ موقف اپنایا کہ انٹری نمبر ۷۴ میں موجود لفظ "انکم" کو وسیع معنی دیتے ہوئے اس میں 'فرضی انکم' کو بھی شامل سمجھا جائے کیونکہ انکم ٹیکس آرڈیننس کا دفعہ ۲[۲۹] آمدن کی مختلف قسموں کو بیان کرتے ہوئے یہ قرار دیتا ہے کہ انکم ٹیکس آرڈیننس کی کسی بھی شق کے تحت کسی بھی رقم کو انکم کی تصور کیا جاسکتا ہے، اسکے علاوہ مفروضہ قانونی استعمال کرتے ہوئے، کسی بھی چیز کو انکم قرار دیا جاسکتا ہے اور دفعہ ۷- ای کے تحت لگنے والے ٹیکس سے مختلف لوگوں کو دی جانے والی استثنیٰ کو منطقی تفریق کے اصول کی بنیاد پر صحیح قرار دیا اور ایک فیصلے¹¹ کو بطور دلیل پیش کیا۔

انٹرنی جزل مرزا ناصر احمد کے مطابق دفعہ ۷- ای کے ٹیکس کی بنیاد محض دفعہ ۷- ای میں استعمال ہونے والی *deeming phrase* یا مفروضہ قانونی نہیں بلکہ اصل بنیاد غیر منقولہ جائیداد کی 'اصل مارکیٹ قیمت' ہے اور اسی کی بنیاد پر سیکشن ۷- ای کے تحت لگنے والے ٹیکس کی مقدار کا تعین کیا جاتا ہے۔ اور پارلیمان کے بنائے ہوئے قانون کو بچانے کی آخری حد تک کوشش کرنے کے اصول اور *principle of read down* کی بنیاد پر یہ استدعا کی کہ دفعہ ۷- ای کے تحت لگنے والے ٹیکس کو بجائے انٹری نمبر ۷۴، انٹری نمبر ۵۰، کے تحت آئینی قرار دیا جائے۔ *principle of read down* کے تحت عدالت کسی وسیع/جامع قانون کی محدود تشریح کر کے یا اسکے کسی ایک حصے یا لفظ کو منسوخ یا رد و بدل کر کے اسکو آئین کے مطابق کرتی ہے بجائے سارے قانون کو ختم کرنے کے۔ انہوں نے سلمان اکرم راجا کے اس موقف کا رد بھی کیا کہ غیر منقولہ جائیداد سے مالی اثاثے کی تعریف میں ہی شامل نہیں جو کہ آگے عدالتی فیصلے میں تفصیل سے موجود ہے۔

¹⁰ ۲۰۱۸ء، سی، ایم، آر، ۹۳۹، ۱۹۹۳ء، سی، ایم، آر، ۲۰۲۲

¹¹ پی، ای، ڈی، ۱۹۹۷ء، سپریم کورٹ، ۵۸۲

بنیادی سوالات:

- دو طرفہ دلائل سننے کے بعد عدالت کے سامنے درج ذیل تین حل طلب سوالات آگئے:
1. انٹری نمبر ۷۴ کی بنیاد پر، کیا مفروضہ قانونی کسی بھی وصولی کو انکم ٹیکس باور کروا سکتی ہے؟
 2. اگر دفعہ ۷۷-اے کے تحت لگائے جانے والے ٹیکس کو مفروضہ قانونی اور دوسری بنیادوں پر نہ بچایا جاسکے تو کیا انٹری نمبر ۵۰ کے تحت غیر منقولہ اثاثے/جائیداد کی مالیتی قدر پر لگنے والا ٹیکس [کیپٹل ویلیو آف ایسٹس] قرار دے کر، بچایا جاسکتا ہے یا نہیں؟
 3. کیا پیش کیے جانے والے عدالتی نظائر، آئینی اختیار کی بنیاد پر سیکشن ۷۷-اے کی امتیازی سلوک والی وہ شقیں جو مختلف لوگوں کو مذکورہ ٹیکس سے استثنیٰ دیتی ہیں، بچائی جاسکتی ہیں یا نہیں؟

غیر منقولہ جائیداد کا "اثاثے" کی تعریف میں شامل ہونا:

سوالات کے جوابات سے قبل عدالت نے اس مؤقف، کہ غیر منقولہ جائیداد سرے سے اثاثے کی تعریف میں ہی شامل نہیں، کا جائزہ لینے کیلئے پہلے انکم ٹیکس اور اثاثوں کی مالیتی قدر پر ٹیکس لگانے والی ۱۹۵۶ء، ۱۹۳۵ء اور ۱۹۶۲ء کے آئینوں کی مختلف انٹریاں اور متعلقہ ٹیکس قوانین کا جائزہ لیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ زرعی آمدن، کل آمدن کا حصہ ہونے کے باوجود ہمیشہ وفاقی انکم ٹیکس مستثنیٰ سے رہی ہے، اسی طرح زرعی زمین کو، اثاثے کی تعریف میں شامل ہونے باوجود "اثاثوں کی مالیتی قدر" پر لگنے والے ٹیکس سے، ۱۹۳۵ء اور ۱۹۵۶ء کے آئین میں مستثنیٰ رکھا گیا لیکن ۱۹۶۲ء کے آئین میں "اثاثوں کی مالیتی قدر" پر نافذ ہونے والے ٹیکس سے، زرعی زمین کو استثنیٰ دینے کے بجائے اسکی خرید و فروخت پر حاصل ہونے والے نفع کو "کیپٹل گین ٹیکس"¹² سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا، یہ یاد رہے کہ "کیپٹل گین ٹیکس"، شروع دن سے لیکر اب تک انکم ٹیکس کا ایک جزو رہا ہے۔ اب اٹھارویں آئینی ترمیم سے قبل ۱۹۷۳ء کے آئین کی انٹری ۷۷ کے تحت زرعی انکم کو ماضی کی طرح وفاقی انکم ٹیکس سے مکمل استثنیٰ حاصل تھا لیکن انٹری ۵۰ کے مطابق "اثاثوں کی مالیتی قدر" پر نافذ ہونے والے ٹیکس سے استثنیٰ کے بجائے تمام غیر منقولہ جائیداد/اثاثوں کی خرید و فروخت پر حاصل ہونے والے نفع کو "کیپٹل گین ٹیکس" سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔

¹² Capital Gain Tax

اب ۱۹۵۶ اور ۱۹۳۵ کے آئینوں کے تحت " اثاثوں کی مالیتی قدر " پر لگنے والے ٹیکس سے زرعی زمین (غیر منقولہ جائیداد) کو باقاعدہ استثنیٰ دینے کی بنیاد پر عدالت نے یہ قرار دیا کہ غیر منقولہ جائیداد اثاثے کی تعریف میں شامل تھی اور یہ کیونکہ اگر غیر منقولہ جائیداد اثاثے کا حصہ نہ ہوتی تو سن ۱۹۵۶ اور ۱۹۳۵ کے آئینوں میں اسکو " اثاثوں کی مالیتی قدر " پر لگنے والے ٹیکس سے استثنیٰ دینے کی ضرورت بھی نہ ہوتی، کیونکہ استثنیٰ دیا ہی تب جاتا ہے جب وہ چیز اس میں شامل ہوں وگرنہ تو استثنیٰ دینے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، اور یہ کہ اٹھارویں ترمیم سے قبل ۱۹۷۳ کے آئین کی انٹری ۵۰ میں، غیر منقولہ جائیداد کی بید خلی محض "کمپنل گین ٹیکس" کے تناظر میں تھی، نہ کہ اثاثے کی تعریف سے۔ عدالت نے اپنے اس مؤقف کے حق میں عدالت عالیہ کے دو فیصلے¹³ بطور نظیر پیش کیے۔ ان فیصلوں میں وفاق نے انٹری ۵۰ کے تحت اثاثوں کی مالیتی قدر پر ٹیکس لگاتے ہوئے، غیر منقولہ جائیداد پر بھی یہ ٹیکس لگایا تھا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ غیر منقولہ جائیداد اٹھارویں ترمیم سے قبل بھی انٹری ۵۰ کے تحت اثاثوں کی تعریف میں شامل تھی۔ اسکے بعد عدالت نے اٹھارویں ترمیم کے ذریعے انٹری ۵۰ میں ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیکر یہ قرار دیا کہ انٹری ۵۰ میں "غیر منقولہ جائیداد پر ٹیکس شامل نہیں" کے جملہ کے ذریعے غیر منقولہ جائیداد کی ذات پر ٹیکس لگانے کی طاقت تو وفاق کے دائرہ اختیار سے باہر کر دی گئی ہے لیکن یہ جملہ غیر منقولہ جائیداد کو اثاثے کی تعریف سے باہر نہیں نکال رہا ہے، اسی لیے اسکی مالیتی قدر پر وفاق انٹری ۵۰ کے تحت ٹیکس لگا سکتا ہے۔ اور اس بات کی تائید عدالت کے فیصلے¹⁴ سے بھی ہوتی ہے۔

پہلے سوال کا جواب:

اس معنی کو حل کرنے کے بعد عدالت اپنے پہلے سوال کے جواب کیلئے اس فیصلے¹⁵، جو کہ مدعی علیہ نے دفعہ ۷- ای کے دفاع میں پیش کیا تھا، کا بغور جائزہ لیا۔ اس کیس میں بھی حکومت نے انکم ٹیکس آرڈیننس ۱۹۷۹ کے دفعہ سی-۸۰ اور سی-سی-۸۰ کے تحت مفروضہ قانونی استعمال کر کے کل آمدن کو خالص آمدن تصور کر کے اس پر انکم ٹیکس کا نفاذ کیا تھا، اور جسے عدالت عالیہ نے جائز بھی قرار دیا تھا لیکن اسی فیصلے کے پیرا گراف نمبر ۳۱ میں کسی چیز کو مفروضہ قانونی کے ذریعے انکم ہاور کر دانے اور اس پر انکم ٹیکس نافذ کرنے والے قوانین کیلئے کچھ اصول وضع کیے گئے ہیں جن کی موجودگی اس قانون کو غیر آئینی قرار دوا سکتی ہے، وہ چند اصول کچھ یوں ہیں:

13 ۱۹۹۲ پی، ٹی، ڈی، ۲۶، ۲۰۰۱ پی، ٹی، ڈی، ۱۵۵

14 ۲۰۱۷ پی، ٹی، ڈی، ۸۰۵

15 پی، ٹی، ڈی، ۱۹۹۷ سپریم کورٹ ۵۸۲

- ایسا ٹیکس قانون اگر مکمل طور پر امتیازی ہو، یا اس میں اس ٹیکس کے حساب کتاب، نفاذ یا باقی متعلقہ معاملات کیلئے ضابطہ موجود نہ ہو۔
- یا جس چیز پر ٹیکس لگایا جا رہا ہے، اسکو عقلی طور پر ایک شہری کی انکم تسلیم نہ کیا جا سکتا ہو۔
- یا جس رقم پر ٹیکس لگایا جا رہا ہو وہ اس ٹیکس دہندہ نے نہ تو وصول کی ہوں نہ ہی وہ جمع ہوئی ہو اور نائی قابل وصول ہو۔

عدالت کے مطابق دفعہ ۷- ای کا ٹیکس نہ صرف ان تمام اصولوں کی خلاف ورزی کر رہا ہے بلکہ انکم ٹیکس آرڈیننس ۲۰۰۱ء کا دفعہ ۲ [۲۹] انکم کی مختلف قسمیں بیان کرتے ہوئے اس جملے "اور کوئی بھی رقم آمدنی کے طور پر سمجھی جاتی ہے" کے ذریعے گو کہ انکم فرض کرنے کی طاقت تو وفاق کو دیتا ہے لیکن لفظ "اماؤنٹ" ¹⁶ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کسی رقم کو انکم فرض کرنے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ وصول کی گئی ہو۔ مندرجہ بالا بحث کی بنیاد پر عدالت نے یہ طے قرار دیا کہ چونکہ دفعہ ۷- ای کے تحت لگایا جانا والا ٹیکس طے کردہ اصول اور ذکر کردہ دفعہ ۲ [۲۹] میں درج معیار پر پورا نہیں اتر رہا ہے تو وفاق غیر منقولہ جائیداد کی مارکیٹ قیمت کو انٹری ۷- ای کے تحت انکم فرض کر کے اس پر انکم ٹیکس لگانے کا مجاز نہیں ہے۔

دوسرے سوال کا جواب:

دوسرے سوال کے جواب کیلئے عدالت نے قرار دیا کہ دفعہ ۷- ای [۱] میں لفظ "انکم" کو "سرمائے کا اثاثہ" سے بدل کر اور دفعہ ۷- ای [۲] میں "آمدنی کے طور پر حاصل کردہ سمجھا جاتا ہے" کا جملہ حذف کر کے اس قانون کو انٹری ۵۰ کے تحت کل اثاثوں کی مالیتی قدر پر لگنے والا ٹیکس قرار دے کر آئین کے مطابق بنایا جا سکتا ہے۔ اس تفریحی اصول کے استعمال کی تائید اس عدالتی فیصلے ¹⁷ سے بھی ہوتی ہے۔ اس پیراگراف کی بہتر سمجھ کیلئے دفعہ ۷- ای کی مذکورہ شقیں براہ راست پڑھیں۔

تیسرے سوال کا جواب:

آخری سوال کے جواب کیلئے عدالت نے اس ٹیکس سے مختلف گروہوں کو ملنے والی استثناءؤں کو پاکستان کے آرٹیکل ۲۵، جو کہ تمام شہریوں سے یکساں سلوک کرنے کی ہدایت دیتا ہے، اور معقول یا منطقی تفریق کا اصول، جس سے مراد مختلف چیزوں، یا انسانوں کی ایسی تفریق کرنا جو محض خواہشات کے بجائے عقلی اور واضح بنیادوں پر

¹⁶ Amount

¹⁷ پی ای ڈی ۷۱۹۹ سپریم کورٹ ۵۸۲

ہوں، کی بنیاد پر جانچا اور یہ قرار دیا کہ پولیس اور باقی فورسز کے شہیدوں کو چھوڑ کر صرف پاکستانی فوج کے شہیدوں یا انکے وارثین کو الاٹ کی جانے والی زمین کو اس ٹیکس سے استثنیٰ دینے کا عمل امتیازی سلوک پر مبنی ہے، جبکہ فوجی جوانوں، وفاقی و صوبائی ملازمین کو الاٹ کی جانے والی زمین کیلئے استثنیٰ کی شرط ان کا جنگ میں زخمی ہونا رکھنا معقول تفریق پر مبنی نہیں کیونکہ صوبائی و وفاقی حکومتوں کے کسی ملازم کے لیے جنگ میں زخمی ہونے کا چانس بہت کم ہے، سوائے جنگ میں زخمی ہونے کی شرط رکھنے کے بجائے انکی ڈیوٹی کے دوران زخمی ہونے کی شرط رکھی جائے، اسکے علاوہ یہ استثنیٰ ایک زخمی یا معذور مزدور جس نے خود زمین خریدی ہو کہ نہ دیگر امتیازی سلوک کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کسی حاضر سروس یا سابق فوجی اہلکار یا صوبائی و وفاقی حکومت کے سابق و حاضر سروس ملازمین کی ایسے زمین جو اصلاً حکومتی الاٹ کی گئی ہو کو اس ٹیکس سے استثنیٰ دینا، ان ملازمین کے ساتھ امتیازی سلوک ہے جن کو کوئی زمین الاٹ نہ کی گئی بلکہ انہوں نے خود اپنی پچت سے خریدی ہو۔

پس عدالت نے مندرجہ بالا استثنائیں آئین کے آرٹیکل ۲۵ کی خلاف ورزی کی بنیاد پر غیر آئینی قرار دی۔

اس کے علاوہ اس ٹیکس میں غصب کرنے اور ملکیت چھیننے کے عنصر پر بھی عدالت نے نکتہ چینی کی اور امید ظاہر کی پارلیمان مجوزہ تبدیلیاں کر کے اس قانون / ٹیکس میں موجود خامیوں کو دور کر کے اسکو آئین کے موافق بنائے گا۔

خلاصہ:

وفاقی پارلیمان آئین میں درج وفاقی قانون سازی کی لسٹ کے انٹری ۷۴ کے تحت کسی غیر معقولہ جائیداد کی مارکیٹ قیمت کو انکم تصور کر کے اس پر ٹیکس لگانے کا مجاز نہیں ہے، ہاں انٹری ۵۰ تحت وہ کل اثاثوں کی مالیتی قدر پر ٹیکس لگا سکتا ہے، اس کے علاوہ پارلیمان بھلے ہی سب انسانوں یا چیزوں سے ایک طرح سلوک نہ کرے بلکہ وہ منطقی بنیادوں پر بنائے مختلف گروہ تشکیل دے سکتا ہے، اور پارلیمان کسی ایک گروہ کے انسانوں یا چیزوں کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کا پابند ہے۔

سپریم کورٹ میں دوسری نظر ثانی قابل سماعت کے حوالے سے، از خود نظر ثانی کے دائرہ اختیار اور کیوریٹیو رپورٹ کے تصور کے حوالے سے فیصلہ

کامران علی چنہ¹⁸

اس کیس میں درخواست گزار دوسری نظر ثانی کروانا چاہتا ہے۔ جسٹس عمر عطا بندیال نے اس کی درخواست کو مسترد کر دیا اور کہا کہ یہ قابل سماعت نہیں ہے۔ جسٹس سید منصور علی شاہ صاحب نے جسٹس عمر عطا بندیال صاحب کے نتائج سے متفق ہو کر اپنا اضافی نوٹ لکھا ہے جس سے تیسرے جج صاحب نے اتفاق کیا ہے جس کے بعد یہ عدالت کا فیصلہ بن گیا ہے۔

حقائق :

اپیل کنندہ نے ۱۹۹۷ء سے نیلامی کے معاملے سے متعلق مدعا علیہان کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں درخواست دائر کی تھی۔ ہائی کورٹ نے ۲۰۱۳ء میں درخواست اجرائے پروانہ منظور کی، لیکن دور کئی بیچ نے ۲۰۱۵ء میں مدعا علیہ کی اپیل خارج کر دی۔ مدعا علیہ نے سپریم کورٹ میں اپیل کی، اور عدالت نے ۲۰۱۸ء میں اس کی اجازت دی۔ سپریم کورٹ نے ہائی کورٹ کے فیصلوں کو ایک طرف رکھ دیا، جس کو لیمپز کی بنیاد [اگر کسی شخص کو کوئی کام کسی مخصوص وقت پر کرنے کے لیے کہا گیا اور وہ اس کو نہ کر پائے] پر درخواست اجرائے پروانہ [رٹ پٹیشن] کو خارج کر دیا۔ اس کے بعد اپیل کنندہ کی بعد ازاں نظر ثانی کی درخواست اور آئین کے تحت احکامات کے لیے درخواست مسترد کر دی گئی۔ موجودہ اپیل درخواست مسترد ہونے کے خلاف دائر کی گئی تھی۔

اہم سوال :

مرکزی مسئلہ دوسری نظر ثانی کی درخواست کی قابل سماعت ہونے کے گرد گھومتا ہے۔ مزید برآں، یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا سپریم کورٹ ایک ہی فیصلے یا حکم کے حوالے سے متعدد بار از خود نظر ثانی کے دائرہ اختیار کا استعمال کر سکتی ہے۔

دلائل :

18 خلاصہ: کامران علی چنہ، گریجویٹ، ایل۔ ایل۔ بی، شہید ذوالفقار علی بھٹو یونیورسٹی آف لاء، کراچی۔

اپیل کنندہ نے استدلال کیا کہ آرٹیکل ۱۸۸ کے تحت نظرثانی کا دائرہ اختیار دوسری نظرثانی کی درخواست پر غور کرنے کی اجازت دیتا ہے، کیونکہ آرٹیکل کی زبان کافی وسیع تھی جو اسے گھیرے میں لے سکتی تھی۔ اپیل کنندہ نے دلیل دی کہ یہ اختیار انصاف کو یقینی بنانے اور غلطیوں کو درست کرنے کے لیے ضروری ہے۔

استدلال:

1. عدالت نے پہلے یہ سوال قائم کیا کہ نظرثانی کا دائرہ اختیار، آئین کے آرٹیکل ۱۸۸ کے مطابق، آئین کے آرٹیکل (جیسے آرٹیکل ۱۸۳ یا ۱۸۵) کے تحت کیے گئے فیصلوں یا احکامات پر نظرثانی کرنے تک محدود ہے۔ اس نے اس بات پر زور دیا کہ آرٹیکل ۱۸۸ خود نظرثانی کے دائرہ اختیار میں منظور کیے گئے فیصلوں یا احکامات کا احاطہ نہیں کرتا۔
2. عدالت نے متعلقہ سپریم کورٹ کے قواعد پر نظر ڈالی جس نے پہلی درخواست کو حتمی طور پر نمٹانے کے بعد میں نظرثانی کی درخواست پر غور کرنے سے روک دیا۔ اس نے پچھلے فیصلوں کی ایک لٹری کا حوالہ دیا جس میں احمد بنام عبدالعزیز، عبدالحمید ڈوگر بنام فیڈریشن آف پاکستان، اور مزید جیسے کیسز کا حوالہ دیتے ہوئے، دوسری نظرثانی کی درخواست کی ناقابل سماعت ہونے پر زور دیا گیا تھا۔ عدالت نے سات رکنی لارجر بیچ کے فیصلے کا حوالہ دیا جس سے اس خیال کو تقویت ملی کہ عدالت کے نظرثانی کے دائرہ اختیار کو ختم کرنے کے بعد دوسری نظرثانی درخواست قابل سماعت نہیں ہے۔
3. عدالت نے آئین کے آرٹیکل ۱۸۸ کا تجزیہ کیا، جو سپریم کورٹ کو نظرثانی کا اختیار دیتا ہے۔ اس نے اس بات پر زور دیا کہ یہ دائرہ اختیار آئین کی دفعات اور عدالت کی طرف سے بنائے گئے قوانین کے تابع ہے۔
4. عدالت نے روشنی ڈالی کہ سپریم کورٹ کے قواعد واضح طور پر بعد میں نظرثانی کی درخواستوں کو روکتے ہیں۔ اس ممانعت کا مقصد فیصلوں کی تکمیل کو یقینی بنانا اور لاتنا ہی قانونی چارہ جوئی کو روکنا ہے۔
5. عدالت نے واضح کیا کہ آرٹیکل ۱۸۸ کا دائرہ خصوصی طور پر سابقہ آرٹیکلز کے تحت کیے گئے فیصلوں یا احکامات پر نظرثانی کرنے سے متعلق ہے، جیسے کہ آرٹیکل ۱۸۳ اصل دائرہ اختیار سے متعلق ہے یا آرٹیکل ۱۸۵ اپیل کے دائرہ اختیار سے متعلق ہے۔

6. عدالت نے استدلال کیا کہ آرٹیکل ۱۸۸ خود نظرثانی کے دائرہ اختیار کا جائزہ لینے سے متعلق نہیں ہے۔ اس نے وضاحت کی کہ دوسری نظرثانی کی درخواستوں پر پابندی کا اطلاق فریقین اور عدالت دونوں پر ہوتا ہے، بشمول از خود نظرثانی کا دائرہ اختیار دوسری بار استعمال کیا گیا۔
7. عدالت نے عدالت عظمیٰ کے فیصلوں کی قطعی نوعیت کو برقرار رکھنے اور قانونی چارہ جوئی کو ختم کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ بالآخر، عدالت نے قرار دیا کہ دوسری نظرثانی کی درخواست، خواہ کسی فریق کی طرف سے دائر کی گئی ہو یا از خود نوٹس کی گئی ہو، آئین کے آرٹیکل ۱۸۸ کے تحت سپریم کورٹ کے قواعد کے ساتھ ساتھ پڑھے جانے کی اجازت نہیں ہے۔

فیصلہ :

عدالت نے کہا کہ آئین کے آرٹیکل ۱۸۸ اور سپریم کورٹ رولز کے تحت نظرثانی کی دوسری درخواست قابل سماعت نہیں ہے۔ اس نے توثیق کی کہ دوسری نظرثانی کی درخواست پر غور کرنے پر پابندی کا مقصد فیصلوں اور احکامات کی حتمی شکل کو یقینی بنانا اور کیس کو کسی منطقی انجام تک پہنچانا ہے۔ اپیل کو میرٹ کے بغیر پایا گیا اور اسے خارج کر دیا گیا۔ اس کے بعد جسٹس محمد علی مظہر نے ایک حالیہ فیصلے کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے نوٹ میں دوسری نظرثانی درخواست کو خارج کرنے کی بنیادوں پر روشنی ڈالی، اس بات پر زور دیا کہ نظرثانی کا مقصد عدم اطمینان کی وجہ سے دوبارہ سماعت کا موقع فراہم کرنے کے بجائے الٹ جانے والی غلطیوں کو دور کرنا ہے۔ انہوں نے سپریم کورٹ رولز کے آرڈر ۲۶ کے ذیلی قاعدہ ۹ کا حوالہ دیا، یہ بتاتے ہوئے کہ پہلا جائزہ مکمل ہونے کے بعد کسی بھی جائزے کی اجازت نہیں ہے۔ انہوں نے جسٹس منصور علی شاہ کے اس نقطہ نظر سے اتفاق کیا کہ دوسری نظرثانی کی درخواست قواعد کے تحت قابل سماعت نہیں ہے، اس دلیل کی بنیاد پر دوسری نظرثانی کی درخواست کو خارج کرنے کی توثیق کی۔

پردہ نشین/ان پڑھ خواتین کے ساتھ قانونی طور پر لین دین کرنے کے شرائط کے حوالے سے سپریم کورٹ کا

فیصلہ¹⁹

محمد عاکف شیر²⁰

حقائق:

درخواست گزار/اپیل کنندہ کا مدعا یہ تھا کہ اس نے مذکورہ پراپرٹی مدعا علیہان خواتین کے بھتیجے [مدعا علیہ نمبر ۳] سے درست فروخت²¹ کے ذریعے خریدی ہے۔ جس کے پاس مدعا علیہان خواتین [مدعا علیہ نمبر ۱ اور ۲] کا مختیار نامہ عام تھا۔ مدعا علیہان ۲ بہنوں نے دعویٰ برائے استقرار حق اور سٹے داخل کیا کہ یہ پراپرٹی ہم نے کبھی نہیں بھیجی اور ہم ہی اس کے مالکان ہیں۔ یہ دعویٰ سول جج اور پھر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج نے بھی خارج کر دیا۔ جس کے خلاف دونوں بہنوں نے ہائی کورٹ میں سول نظر ثانی داخل کی اور لوئر کورٹس کے دونوں فیصلوں کو معطل کر دیئے۔ اس کے خلاف درخواست گزار نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ درخواست گزار کے وکیل کا موقف تھا کہ مختیار نامے اور فروخت کو مدعا علیہان ۱ اور ۲ نے اپنے دعوے میں تسلیم کر لیا ہے۔ لہذا اس میں کوئی مسئلہ نہیں ہے اور یہ کیس نہیں بنتا۔ مدعا علیہان ۱ اور ۲ کے وکیل کا موقف تھا کہ دونوں بہنوں / مدعا علیہان ۱ اور ۲ نے اپنے بھتیجے پر اعتماد کر کے مختیار نامہ عام بنایا تھا کیونکہ وہ دونوں ان پڑھ، پردہ نشین ہیں۔ لیکن اس نے اعتماد کا ناجائز استعمال کیا اور مدعا علیہان کو اس سے نقصان پہنچایا۔ اور اس فروخت کا ان کو علم نہیں تھا ناہی انکی رضا شامل تھی بلکہ دھوکے سے اس پراپرٹی کو فروخت کیا گیا۔

عدالت کے سامنے یہ سوال تھا کہ آیا مدعا علیہ ۳ بھتیجے نے پراپرٹی درخواست گزار کو فروخت کی تھی؟

درخواست گزار یہ ثابت کرنے میں ناکام رہے۔ ناہی کوئی ثبوت نا کوئی گواہ پیش کیا۔ ریونیو افسر کے مطابق اس فروخت کی کوئی تفصیل موجود نہیں تھا اور صرف ایک زبانی معاہدہ ہوا تھا۔ مدعا علیہ ۳ خود بھی پیش نہیں ہوئے اور ان کے حق میں تو ایک طرف آرڈر پاس ہوا۔ درخواست گزار یہ ثابت کرنے میں بھی ناکام رہے کہ اس معاہدے کا علم مدعا علیہان ۱ اور ۲ کو تھا۔

¹⁹ سول اپیل نمبر ۳۰۸ آف ۲۰۲۳ء، بہ عنوان: پرویز اختر بنام مسات فریدہ بی بی وغیرہ

²⁰ ایڈووکیٹ، خیبر پختونخوا ہاؤس

عدالت نے مختلف فیصلوں کا حوالہ دے کر بتایا کہ پردہ نشین / ان پڑھ خواتین کے علم میں اس طرح کے معاہدے اور لین دین لانان کو معاہدہ سمجھانا اور ان کی رضامندی صراحت کے ساتھ پینا ضروری ہے جو کہ اس معاہدے میں نہیں ہے۔

صرف مختیار نامہ کافی نہیں ہے۔ جس سے مدعا علیہ اور درخواست گزار کا دھوکہ واضح ہو جاتا ہے کیونکہ اس سے پہلے بھی مدعا علیہ ۳ مزید کئی پراپرٹی درخواست گزار کو فروخت کر چکے تھے اور یہ ایک پراپرٹی ڈیلر کے طور پر کام کرتے رہے۔ یہ حقیقت درخواست گزار نے عدالت کے سامنے تسلیم کر لی تھی۔ اور یہ چاہتے تو آسانی سے مدعا علیہان کو اس معاہدے کے بارے میں بتا سکتے تھے کیونکہ سب ایک علاقے کے رہائشی ہیں۔ کورٹ نے میاں اللہ دتہ کیس کا حوالہ دے کر بتایا کہ مختیار نامی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اچھی نیت، علم اور رضامندی کو ثابت کرے۔ جو کہ یہاں اس کیس میں کم ہے۔

عدالت نے فرمایا کہ پردہ نشین خواتین چوں کہ گھروں کے اندر رہتی ہیں اور ان میں اکثر دنیاوی معاملات سے الگ تھلگ اور نابالغ رہتی ہیں اس لیے ان کی سمجھ اس طرح کے لین دین کے لیے کم ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے حقوق کا بہتر دفاع اور حفاظت نہیں کر سکتی۔ اس لیے ان حالات میں عدالتوں کو ان کا بطور محافظ سامنے آنا چاہیے۔ کسی بھی پردہ نشین خاتون کے ساتھ کوئی بھی لین دین یا معاہدے سے قبل یہ یقینی بنانا ضروری ہے کہ وہ معاہدہ اس خاتون کو اسی زبان میں سمجھا گیا ہو، اس کے مضمرات بھی واضح کیے گئے ہوں اور اس کی رضا مندی ملی گئی ہو بصورت دیگر وہ معاہدہ قانونی طور پر قابل اعتبار نہیں ٹہرے گا۔

مندرجہ بالا وجوہات کو دیکھتے ہوئے سپریم کورٹ کے تین رکنی بینچ نے ایک - دو کے اکثریت سے اپیل کو خارج کرتے ہوئے ہائی کورٹ کے فیصلے کو برقرار رکھا۔

بینچ میں موجود دو رکن جسٹس اعجاز الحسن اور عائشہ ملک کے ساتھ، تیسرے جج جمال خان مندوخیل نے، اختلاف کیا اور اپنا اختلافی نوٹ لکھا۔

جسٹس جمال خان مندوخیل صاحب نے کہا ہے کہ مدعا علیہان ۱ اور ۲ کو علم تھا اور یہ معاہدہ دھوکے میں نہیں آتا کیونکہ انہوں نے اس معاہدے پر کوئی اعتراض نہیں کیا ہے اور جو پارٹی بھی دھوکے کا دعویٰ کرتے ہیں تو ان کو خود ثابت کرنا ہوتا ہے جو کہ یہاں پر نہیں کیا گیا ہے۔ جسٹس صاحب نے کہا کہ ہائی کورٹ نے حقائق کو صحیح طرح سے نہیں پڑھا تھا۔

صوبائی قوانین کی تشریح متعلقہ صوبے کی ہائی کورٹ کر سکتی ہے۔ کسی اور صوبے کی ہائی کورٹ یا اسلام آباد ہائی کورٹ ان کی تشریح نہیں کر سکتی، اس حوالے سے سپریم کورٹ کا عمدہ فیصلہ²²

طاہر خان وزیر²³

حقائق:

سپرنگ ائل اینڈ گیس سرورسز پاکستان، اسلام آباد (مدعی) اور او۔ جی۔ ڈی۔ سی۔ ایل کے مابین دو معاہدات ہوتے ہیں۔ ان معاہدات کے تحت مدعیان کے ذمے سیمینٹیشن کا کام تھا جو انہوں نے پورا کر دیا اور ساتھ ہی چاروں صوبوں کے قوانین کے تحت اس کام پہ سیلز ٹیکس بھی ادا کی۔ مدعی کا موقف تھا کہ سیلز ٹیکس ادا کرنے کی ذمہ داری دراصل او۔ جی۔ ڈی۔ سی۔ ایل کی تھی جو اب مدعی کو واپس ادا کرنے کے ذمے دار ہے۔ او۔ جی۔ ڈی۔ سی۔ ایل ایسا کرنے سے انکار کرتا ہے جس کی وجہ سے مدعی اسلام آباد ہائی کورٹ میں رٹ دائر کرتے ہے۔

اسلام آباد ہائی کورٹ کا سنگل بیچ ان کی درخواست قبول کرتا ہے (یعنی اسلام آباد ہائی کورٹ صوبوں میں رائج قانون کی تشریح کر دیتی ہے) جسے جواب دہندہ انٹرا کورٹ ایپل میں چیلنج کرتا ہے جس کا نتیجہ ان کے جواب دہندہ حق میں آتا ہے، یعنی سنگل بیچ کا فیصلہ کالعدم قرار دیا جاتا ہے۔

بنیادی سوال:

کیا صوبائی قوانین کی تشریح اسلام آباد ہائی کورٹ کر سکتی ہے؟

سپریم کورٹ کی کاروائی:

سپریم کورٹ سب سے پہلے درخواست کی قابل رواں ہونے سے متعلق سوال کرتی ہے جس کے جواب میں مدعی موقف اپناتا ہے کہ:

1. مدعی کمپنی کی رجسٹرڈ آفس اسلام آباد میں ہے معاہدات بھی یہی ہوئے ہیں۔
2. جواب دہندہ نے خاص/ واضح طور پر پیشین کے قابل رواں ہونے سے متعلق عدالت کے سامنے اعتراض نہیں اٹھائے، اس کا مطلب ہے کہ اس نے عدالت کی اختیار ساعت مان لی تھی۔

22 سی۔ پی نمبر ۴۰ آف ۲۰۲۱ء، عنوان: میسرز سپرنٹ آئل اینڈ گیس سرورسز پاکستان ایف۔ زیڈ۔ سی، اسلام آباد بمقابلہ آئل اینڈ گیس

ڈوڈلپوٹ کھنٹی لمیٹڈ، اسلام آباد

23 ایڈووکیٹ و ممبر ٹیم آئین و قانون

سپریم کورٹ پہلے نقطہ کے حوالے سے قرار دیتی ہے پاکستان میں چار صوبے اور اسلام آباد دار الحکومت ہے جن کے قوانین کی تشریح صرف متعلقہ ہائی کورٹ کر سکتی ہیں۔ اس کے برعکس نہیں۔ موجودہ کیس میں اسلام آباد قوانین کے اطلاق/تشریح سے متعلق سوال نہیں تھا۔ دوسرے نقطہ پہ آتے ہوئے عدالت نے قرار دیا کہ یہ مسمم قانون ہے کہ فریقین کسی عدالت کو اختیار ساعت نہیں عطا کر سکتا۔ یہاں عدالت نے ایڈن بلڈرز کیس²⁴ پہ انحصار کیا ہے۔

اس کے بعد عدالت آئین کے آرٹیکل ۱۹۹ پہ آتے ہوئے اہم عوامل طے کرتی ہیں جن کے ہوتے ہوئے تحت ہائی کورٹ میں دائر رٹ درخواستیں نہیں کہ جاسکتی ہے :

1. جب کوئی دوسرا مناسب چارہ کار دست یاب ہو۔ { یہاں عدالت نے قرار دیا کہ موجودہ کیس میں مدعی کے پاس دیوانی دعویٰ دائر کرنا معاہدے کے ثالثی کے شق سے مدد لینے کا اختیار موجود تھا۔
2. جب معاہدہ کی تشریح کا سوال ہو۔
3. جب تکنیکی اور پیچیدہ مسئلہ ہو۔
4. جب ثبوت رکارڈ کرنے کی ضرورت ہو۔
5. جب کیس متنازعہ حقائق پہ مبنی ہو۔

کیس کے میرٹ پر نہ جاتے ہوئے (تاکہ فریقین کے حقوق متاثر نہ ہو) عدالت قرار دیتی ہے کہ اس کیس میں مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر اسلام آباد ہائی کورٹ کے پاس اختیار ساعت نہ تھا جس کی وجہ سے سنگل اور ڈویژنل بینچ کے فیصلے بغیر کسی قانونی اثر کے قرار دئے جاتے ہیں۔

خلاصہ:

صوبائی (اسلام آباد کیسینٹل) قوانین کی تشریح متعلقہ ہائی کورٹ ہی کر سکتی ہے؛ فریقین اگر چاہے بھی تو باہمی رضامندی سے کسی ہائی کورٹ کو اختیار ساعت نہیں دے سکتے؛ آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت درخواست مخصوص حالات میں دائر کی جاسکتی ہے۔

ضابطہ دیوانی کی دفعہ ۱۰۰ کے تحت دوسری ایپل پریسیم کورٹ کا ایک اہم فیصلہ²⁵

عاقب فاروق²⁶

زیر بحث سوال:

سپریم کورٹ کے دور کئی بیٹج (چیف جسٹس عمر عطا بندیال اور جسٹس محمد علی مظہر) کے سامنے قانونی سوال یہ تھا کہ کیا پہلی ایپل خارج ہونے کے بعد ضابطہ دیوانی کی دفعہ ۱۰۰ کے تحت ہائی کورٹ کے لیے دوسری ایپل منظور کرنا درست تھا یا نہیں؟

حقائق:

ایپل کنندہ نے پیڑدادن خان، ضلع جہلم میں واقع ایک جائیداد کی بابت دعویٰ و خلیابی بذریعہ شفعہ دائر کیا۔ یہ پراپرٹی مسؤل الیہ کے پیش رو نے خریدی تھی جو دوران مقدمہ ہی وفات پا گئے۔ دیوانی عدالے نے فیصلہ ایپل کنندہ کے حق میں کیا جبکہ مسؤل الیہ نے اس فیصلہ کے خلاف ڈسٹرکٹ کورٹ میں ایپل دائر کی جو کہ خارج ہوئی۔ اس فیصلے سے ناخوش مسؤل الیہ نے ضابطہ دیوانی کی دفعہ ۱۰۰ کے تحت دوسری ایپل لاہور ہائی کورٹ راولپنڈی بیٹج میں دائر کی اور ہائی کورٹ نے مسؤل الیہ کی ایپل منظور کرتے ہوئے سول اور ڈسٹرکٹ دونوں عدالتوں کے فیصلے منسوخ کر دیے۔

بیج کا ضابطہ دیوانی کی دفعہ ۱۰۰ کے دائرہ کار پر استدلال:

فریقین کے وکلاء کے قانونی دلائل سننے کے بعد جسٹس محمد علی مظہر نے لکھا کہ ضابطہ دیوانی کی دفعہ ۱۰۰ کا دائرہ کار صرف ایسی ایپلوں کی حد تک ہے جہاں کوئی قانونی سوال زیر بحث ہو۔ انہوں نے لکھا کہ ہائی کورٹ نے کوئی قانونی سوال واضح نہیں کیا اور نہ ہی مقدمہ میں ہونے والی شہادتوں کا بخوبی جائزہ لیا۔ جسٹس محمد علی مظہر نے واضح کیا کہ ضابطہ دیوانی کی دفعہ ۱۰۰ کے تحت صرف مندرجہ ذیل تین بنیادوں پر دوسری ایپل دائر کی جاسکتی ہے:

1. فیصلہ قانون یا اس سے متعلق معاملات کے خلاف ہے۔
2. فیصلہ میں قانون یا اس سے متعلق کوئی تنقیح واضح میں ناکام ہے۔

²⁵ مظہر اقبال بنام رفعت پروین وغیرہ"

²⁶ طالب علم شعبہ قانون، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور۔

3. ضابطہ دیوانی یا کسی دوسرے متعلقہ قانون میں دیے گئے طریقہ کار سے ہٹ کر کوئی بے ضابطگی

ہے۔

جسٹس محمد علی مظہر نے واضح کیا کہ ضابطہ دیوانی کی دفعہ ۱۰۰ میں واضح لکھا ہے کہ کوئی دوسری اپیل دائر نہیں ہو سکتی ماسوائے ضابطہ دیوانی کی دفعہ ۱۰۰ میں بیان کردہ بنیادوں کے۔ مزید واضح کیا کہ اگر حقائق کی بابت کوئی سوال زیر بحث ہے تو ضابطہ دیوانی کی دفعہ ۹۶ کا اطلاق ہوگا۔ اسی طرح معزز جج صاحب نے ضابطہ دیوانی کے آرڈر ۳۱ کے رول ۳۱ کا حوالہ دیا کہ اپیل کا فیصلہ کرتے وقت مندرجہ ذیل لوازمات کا فیصلے میں ذکر ہونا لازمی ہے:

1. فیصلہ کے نکات

2. فیصلہ

3. فیصلہ کی وجوہات

4. ریویف؛ اصل ڈگری میں کہاں اور کیا تبدیلی فیصلہ میں تحریر کر کے اپیل گزار کو ریویف دیا گیا ہے۔

لیکن اس مقدمے میں ہائی کورٹ نے ان سب قانونی دفعات کو مد نظر رکھے بغیر فیصلہ کیا تھا۔

فیصلہ:

سپریم کورٹ کے دور کئی بیٹچ نے متفقہ طور پر اپیل منظور کرتے ہوئے ہائی کورٹ کا فیصلہ مسترد کیا اور مقدمہ واپس کر کے ہائی کورٹ کو بھجوا دیا گیا۔

تنازعات کے غیر رسمی حل {اے۔ ڈی۔ آر} میں فریقین کی رضامندی اور حکم امتناعی کے حوالے سے عدالت

عالیہ پشاور کا ایک اہم فیصلہ²⁷

احتشام الحق²⁸

بنیادی سوال:

فریقین کی طرف سے دی جانے والی رضامندی کب تک نافذ العمل رہی گی اور کیا تینوں فریقین کے پاس حالت اصلی تبدیل کرنے²⁹ سے کتنا اختیار ہے یا نہیں؟

27 یہ اہم فیصلہ جسٹس وقار احمد نے لکھا ہے اور اسے ۲۰۲۳ کے۔ پی۔ ایل۔ جے ۹۵۴ کے طور پر تلاش اور حوالہ دیا جاسکتا ہے۔

28 ایڈووکیٹ، پشاور بار ایسیوسی ایشن۔

حقائق:

ضلع کرم میں فریقین کے درمیان زمین کے تنازعے پر، جس میں جرگہ کے ممبران کی مشاورت سے اسی زمین پر مختلف جگہوں پر آبادی شروع کرنے کی تجویز دی تھی جس کے نتیجے میں فریقین نے باقاعدہ آبادی/کمپاؤنڈ بنائیں۔ بعد ازاں اسی جرگے کے ایک ممبر لوئر کرم سدہ کے اسٹنٹ کمشنر کے ہاں استغاثہ درج کرتا ہے اور ہاوسز/رومز خالی کرنے کے ساتھ اس وقت قبضہ لینے کی درخواست کرتا ہے جب تک فریقین کے درمیان تنازعے کا کوئی مناسب حل نہ نکل آئے۔ حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے اسٹنٹ کمشنر جو کہ موجودہ درخواست میں مدعا علیہ نمبر ہے، اے ڈی آر ایکٹ ۲۰۲۱ کے دفعہ ۳ پر انحصار کرتے ہوئے تنازعہ ہاوسز/کمپاؤنڈ] کو خالی کرنے کے ساتھ ساتھ قبضہ لے لیتا ہے اور وہاں پر پولیس کو تعینات کر دیتا ہے جس کے خلاف موجودہ مدعی پشاور کے عدالت عالیہ میں موجودہ درخواست دائر کرتا ہے۔

نوٹ: اے۔ ڈی۔ آر ایکٹ ۲۰۲۱ کے زیر دفعہ ۳ کے تحت دیوانی عدالت کے پاس اختیار ہے کہ وہ کسی تنازعے کو اے۔ ڈی۔ آر کے لیے بھیج سکتا ہے جس کے لے:

فریقین کی رضامندی، حالات اس طرح ہو کہ اے۔ ڈی۔ آر کے ذریعے حل ممکن ہو، اور کوئی پیچیدہ قانونی یا واقعاتی سوال نہ ہو۔ اسی طرح دفعہ ۳ [۲] میں ڈپٹی کمشنر یا کوئی دوسرا آفیسر جو صوبائی حکومت نامزد کرے، کو اختیار بنایا گیا ہے کہ وہ کسی معاملے کو اے۔ ڈی۔ آر کے ذریعے حل کر سکتا ہے لیکن اس کے لیے بھی فریقین کی رضامندی ناگزیر ہے اور ذیلی دفعہ ۳ [۶] میں تنازعے کے مزید بگاڑ کے روک تھام کے خاطر، ٹائٹین پارلیمنٹنگ اتھارٹی کو اصلی حالت برقرار رکھنے کی حد تک حکم امتناعی دینے کا اختیار ہے

دلائل سننے کے بعد عدالت نے، چونکہ مدعی نے اسٹنٹ کمشنر کے حکم کو چیلنج کر دیا ہے لہذا عدالت خود کو صرف اس حد تک محدود رکھتی ہے کہ جو حکم اسٹنٹ کمشنر یعنی موجودہ مدعا علیہ نمبر ہے، نے پاس کیا وہ ٹھیک ہے کہ نہیں؟ یعنی اس کی قانونی حیثیت کیا ہے؟۔

فیصلہ:

عدالت اپنے فیصلے کا آغاز، کہ ذیلی دفعہ ۳ [۱] میں دیوانی عدالت جبکہ دفعہ ۳ [۲] میں ڈپٹی کمشنر یا دوسرے آفیسر جو کہ صوبائی حکومت نامزد کرتی ہے، کو اختیار بنایا گیا ہے کہ وہ تنازعے کو اے ڈی آر کے لیے بھیج دے لیکن اس کے لیے فریقین کی رضامندی لازمی ہیں اور دوسری بات زیر دفعہ ۳ [۶] میں حکم امتناعی کا مقصد ان کے الفاظ سے

صریح اور واضح ہے کہ ٹائٹلین اصلی حالت برقرار رکھنے کی حد تک مجاز ہے لہذا زبردفعہ ۳ کے تحت دی گئی آرڈر کیلئے ضروری ہے کہ:

1. وہ فریقین کے رضامندی سے ہوں جس کے لے انہوں نے باقاعدہ لکھنے میں اختیار دیا ہوں
2. یہ صرف ان حالت میں دیا جاسکتا ہے کہ جہاں پر تنازعہ، مزید بگاڑ اور بد امنی کا خدشہ ہوں
3. اسی طرح اصلی حالت برقرار رکھنے کی حد تک اختیار حاصل اصلی حالت³⁰ کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔
4. اور یہ حکم ایک خاص وقت کے لیے ہوگا۔

لہذا اے۔ ڈی۔ آر کے لیے فریقین کی رضامندی دونوں صورتوں میں لازمی ہے جب کہ موجودہ کیس میں تنازعے کو جرگہ ممبران کو سپرد کرتے وقت مدعی کی رضامندی شامل تھی لیکن جب معاملہ مدعا علیہ نمبر یعنی اسٹنٹ کمشنر کے سپرد ہوا تو مدعی نے تب رضامندی نہیں دی تھی بلکہ مشاورت کے لئے وقت مانگ لیا تھا لہذا حالات و واقعات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہے کہ مدعا علیہ نمبر انے مدعی کی رضامندی حاصل نہیں کی کیونکہ جو رضامندی جرگہ کے حد تک دیا گیا تھا اس کو مدعا علیہ نمبر فرضی نہیں سمجھ سکتے اس کے لیے الگ سے رضامندی ضروری تھی جو کہ مدعا علیہ نے حاصل نہیں کی لہذا ہاؤسز/کمپاؤنڈز خالی کرنے کے لئے جو حکم مدعا علیہ نے دیا ہے وہ غیر قانونی ہے۔

خلاصہ:

زبردفعہ ۱۳ اے۔ ڈی۔ آر ایکٹ ۲۰۲۱ کے تحت تنازعات کا غیر رسمی حل کیلئے فریقین کی باقاعدہ رضامندی ضروری ہے اور ریفرنگ اتھارٹی یا ٹائٹلین کے پاس حکم امتناعی کا اختیار صرف اصلی حالت کو برقرار رکھنے کی حد تک ہے۔

³⁰ Status Quo: The status quo is the current state of things.

سپریم کورٹ کا "ٹریڈ مارک" کی رجسٹریشن ک میں لفظ "اطمینان" کی تشریح اور میعاد کے معاملات میں کسی چیز کو باقاعدہ طریقہ کار کے مطابق کرنے کے حوالے سے اہم فیصلہ³¹

علیشہ انجم³²

حقائق:

درخواست گزار نے ٹریڈ مارک "ٹی، آر، آئی، ایس، اے" کو ۱۴ جولائی ۱۹۸۵ کو رجسٹر کروایا تھا اور جواب دہندہ نمبر ۱ نے اسی ٹریڈ مارک کے اندراج کی درخواست ۲۳ اپریل ۱۹۹۷ کو جمع کروائی تھی۔ درخواست گزار نے یہ الزام لگایا کہ جواب دہندہ نمبر ۱ کو درخواست گزار کے رجسٹرڈ ٹریڈ مارک کا کوئی حق نہیں ہے اور جواب دہندہ نمبر ۱ ٹریڈ مارک "ٹی، آر، آئی، ایس، اے" کو دھوکہ دہی کرنے کی کوشش کر رہا ہے ٹریڈ مارک ایکٹ ۱۹۳۰ کے دفعہ ۱۵ {۲} کو ترمیم شدہ ٹریڈ مارک رولز ۱۹۶۳ کے قاعدہ ۳۰ کے ساتھ پڑھا گیا جس میں ۵۲ کا وقت مقرر کیا گیا ہے مخالف دعویٰ دائر کرنے کے لیے۔ نظر ثانی شدہ قواعد، ۱۹۶۳ کے قاعدہ ۷۶ کے تحت رجسٹرار کو خصوصی دائرہ اختیار حاصل ہے کہ وہ مناسب جواز پر خود کو مطمئن کرنے کے بعد کسی بھی کام کے لیے یا کسی بھی کاروائی کے لیے وقت بڑھانے کا اختیار رکھتا ہے اور رجسٹرار اپنے اس صوابدید کو اطمینان اور معروضی معیار کی بنیاد پر استعمال کر سکتا ہے۔ رجسٹرار نے جواب دہندہ نمبر ۱ اور درخواست گزار کا موقف سننے کے بعد درخواست گزار کے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے اسے مخالف دعویٰ دائر کرنے کے لیے مزید مہلت دے دی۔ جواب دہندہ نمبر ۱ نے رجسٹرار کے فیصلے کے خلاف سندھ ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی۔ سندھ ہائی کورٹ نے جواب دہندہ نمبر ۱ کے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے رجسٹرار کی طرف سے منظور کردہ ٹریڈ مارک کے فیصلے کو ایک طرف کر دیا اور درخواست گزار نے سندھ ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی۔

درخواست گزار کے وکیل نے یہ موقف اختیار کیا کہ رجسٹرار کا فیصلہ اس بنیاد پر تھا کہ درخواست گزار کو جواب دہندہ نمبر ۱ کی درخواست کی اشاعت سے پہلے کبھی نوٹس جاری نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی اسے نوٹس موصول ہوا تھا کیونکہ۔ نظر ثانی شدہ قواعد، ۱۹۶۳ کے قاعدہ ۲۳ کے تحت تفتیش باقاعدہ درست طریقے سے نہیں کی گئی تھی۔

31 اس فیصلے کو ۲۰۲۱ کے سول پبلیش نمبر "۱۳۹۶-۱" کے طور پر حوالہ دیا گیا ہے۔

32 طالب علم، شعبہ قانون، بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد

جواب دہندہ نمبر ۱ کے وکیل نے موقف اختیار کیا کہ ٹریڈ مارک کی رجسٹریشن کے لیے درخواست ۲۳ اپریل ۱۹۹۷ء کو تمام ضروری اقدامات کی تعمیل کے بعد جمع کروائی گئی تھی اور ٹریڈ مارک جرنل نمبر ۵۹۸ میں نومبر ۲۰۰۰ء میں مشترکہ کی گئی تھی لہذا کوئی بھی شخص نظر ثانی شدہ رولز، ۱۹۶۳ء کے مطابق اشتہار کی تاریخ سے ۲ ماہ کی مقررہ مدت کے اندر مخالف دعویٰ داخل کر کے رجسٹریشن کی مخالفت کر سکتا ہے، لیکن ۱۰ مارچ ۲۰۰۳ء تک کوئی مخالفت درج نہیں کی گئی تھی، اس حقیقت کے باوجود ۲ ماہ کی قانونی مدت ختم ہو گئی۔

فریقین کی بات سننے کے بعد عدالت نے اپنے فیصلے کا آغاز اس نقطے سے کیا کہ عام طور پر، ایک قانون میں فراہم کردہ طریقہ کار ہوتا ہے جس میں ایک مخصوص عمل کو ایک مخصوص طریقے سے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن بعض اوقات اسے محض ایک رسمی طور پر لیا جاتا ہے اور یہ بہت ہی لاپرواہی اور مجرمانہ انداز میں کیا جاتا ہے۔ یہ اکثر اوقات میعاد کے معاملات میں ہوتا ہے جہاں ایک قانون کے مطابق کسی کام کو ایک مخصوص مدت میں ایک خاص طریقے سے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن لوگ اسے ہلکے میں لیتے ہیں۔ سپریم کورٹ نے اپنے حالیہ فیصلے میں کہا کہ اصول بہت واضح ہے کہ رجسٹرار کو پہلے خود کو مطمئن کیے بغیر توسیع دینے کا اختیار نہیں ہے۔ عدالت نے لفظ "اطمینان" کی بھی تعریف کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "ایک ایسا ذہن جو کسی واضح نتیجے پر پہنچا ہو۔" یعنی درخواست گزار کو معقول وجہ دینی ہوگی رجسٹرار کو قائل کرنے کے لیے کہ وہ واقعی ہی مزید وقت کی توسیع کا مستحق ہے۔ عدالت نے مزید کہا کہ بعض اوقات کوئی قاعدہ لازمی معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت یہ قانون کو مجموعی طور پر مد نظر رکھنے کے بعد "ڈائریکٹری" ³³ ہوتا ہے اور بعض اوقات کوئی قاعدہ ڈائریکٹری لگتا ہے لیکن درحقیقت وہ لازمی ہوتا ہے۔ لہذا یہ فیصلہ کرنے کے لیے اکیلے ضابطے کو مد نظر نہیں رکھا جائے کہ آیا یہ لازمی ہے یا ڈائریکٹری، بلکہ دیگر منسلک دفعات ہیں اور اس قاعدے کی پوری انتظام اور اس کی نوعیت کا تجزیہ کرنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا وہ ڈائریکٹری ہے یا لازمی ہے۔ اور رجسٹرار کو خود کار طور پر توسیع دینے سے پہلے خود کو مطمئن کرنا لازمی ہے۔ رجسٹرار نے نہ صرف یہ کام خود کار طریقے سے کیا تھا بلکہ اس نے تجویز کردہ طریقے پر عمل نہ کرتے ہوئے یہ کام کیا ہے۔ عدالت نے آخر میں سندھ ہائی کورٹ کے فیصلے کو درست قرار دیتے ہوئے درخواست مسترد کر دی کیونکہ جواب دہندہ نمبر ۱ نے تمام قانونی اقدامات کے بعد رجسٹریشن کروائی اور اس کا باقاعدہ اشتہار دیا گیا تھا اور ٹریڈ مارک جرنل میں بھی مشترکہ کیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود بھی درخواست گزار اس پر توجہ نہیں دیتا اور

مدت ختم ہونے کے بعد آتا ہے تو کورٹ ایک باقاعدہ کام کو باقاعدہ طریقے سے ہونا چاہیے کہ کبھی بے کیونکہ جب کسی چیز کو کسی خاص طریقے سے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، تو اسے اسی طریقے سے کیا جانا چاہیے۔

قرارداد مقاصد، اقتدار اعلیٰ، بنیادی آئینی ساخت، عدلیہ، مقننہ کے مابین اختیارات کی تقسیم اور آپسی تعلق کے

حوالے سے مشہور ضیاء الرحمن کیس³⁴

محمد اسد³⁵

حقائق:

یہ کیس بنیادی طور پر سال ۱۹۷۲ء کے دوران کچھ سیاسی ورکروں (محمد مختار رانا، محمد ریاض) پر ۱۰ افرادی کو تعزیرات پاکستان کی مختلف دفعات اور مارشل لاء ریگولیشنز کے تحت ایف۔ آئی۔ آر کاٹنے، اور نتیجتاً مختار رانا کو گرفتار کرنے، جبکہ پانچ صحافیوں (الطاف حسن قریشی، اعجاز حسن قریشی، مجیب الرحمن شامی، مظفر قادر، حسین نقی) کو بھی مارشل لاء ریگولیشنز کے تحت ۵-۶ اپریل کے دوران گرفتار کرنے، اور پھر ملٹری کورٹ کا ۱۰-۱۳ اپریل کے دوران مذکورہ سب لوگوں کا بعد از بنیادی ٹرائل کے مختلف سزائیں دینے اور نتیجتاً ان سب کاروائیوں کو مذکورہ صحافیوں اور سیاسی ورکروں کی جانب سے لاہور ہائی کورٹ میں مختلف رٹ پیشینگی کی وساطت سے مختلف بنیادوں پر چیلنج کرنے سے، شروع ہوا۔ ۶ جون کو مذکورہ درخواستوں میں پیش کئے گئے پیشتر اعتراضات کو تسلیم کرتے ہوئے، ہائیکورٹ نے کچھ مدعیان کی سزائوں کو ختم کیا اور کچھ کے کیسز کو سوپریمن عدالتوں میں پھر سے چلانے کا حکم دیا، جبکہ حکومت نے اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ سے رجوع کیا۔

کیس کی مزید تفصیل میں جانے سے پہلے کچھ بنیادی معلومات جو اس کیس کو سمجھنے کیلئے اہم ہے، کو دیکھ لیتے ہیں۔ پہلی بات یہ کہ جس وقت ان مذکورہ لوگوں کو گرفتار کیا گیا اور سزائیں دی گئی، اس وقت ملک میں گوکہ مارشل لاء نافذ تھا اور بھٹو صاحب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے لیکن ۱۹۷۰ء کے جنرل یحییٰ خان کے لیگل فریم ورک آرڈر (ایل۔ ایف۔ او) کے تحت ہونے والے الیکشن کے نتیجے میں پارلیمان کے ممبران منتخب ہو چکے تھے، اور ملٹری کورٹ میں اس کیس کے خاتمے کے ایک دن بعد یعنی ۱۱۳ اپریل کو منتخب کردہ ممبران اسمبلی کا پہلا اجلاس بلا یا گیا جنہوں نے

34 پانچ رکنی اس بیچ کا فیصلہ چیف جسٹس حود الرحمن نے تحریر کیا جس کو پی۔ ایل۔ ڈی ۱۹۷۳ سپریم کورٹ ۳۹ کے تحت تلاش کیا جاسکتا

ہے۔

35 طالب علم شریعہ و قانون، ممبر آئین و قانون

۱۲۰ اپریل ۱۹۷۲ء کی عبوری آئین منظور کیا اور ۲۱ اپریل کو اس آئین کے نفاذ کے ساتھ مارشل لاء اٹھایا گیا۔ لیکن ۲۰ اپریل، ۱۹۷۲ء کو ہی سپریم کورٹ نے عاصمہ جیلانی کیس³⁶ میں جزل بیجی خان کو ایک قابض اور اسکے تمام اقدامات/احکامات کو کالعدم قرار دیتے ہوئے کہا کہ اسکے لیے گئے اقدامات میں سے صرف مفاد عامہ وغیرہ کیلئے ضروری اقدامات کو نظریہ ضرورت کے تحت عدالت معاف اور قانونی قرار دی سکتی ہے۔ اس فیصلہ کے نتیجے کے طور پر کہ مارشل لاء ریگولیشنز، آرڈرز وغیرہ اور اسکے تحت بنائی عدالتیں، گرفتاریاں، سزائیں اور باقی کافی کچھ غیر آئینی قرار پاسکتا تھا لیکن پارلیمان نے ایسا ہونے سے بچنے کیلئے عبوری آئین کے آرٹیکل ۲۸۱ میں مارشل ریگولیشنز، آرڈرز وغیرہ اور اسکے کے تحت لیے گئے اقدامات کو آئینی تحفظ دیا جسکی تفصیل آگے آئے گی۔ سپریم کورٹ میں اپیل کرنے سے پہلے ہی حکومت نے تمام صحافیوں کی سزائوں کو گو کہ خود معاف کر دیا تھا، لیکن بقول انارنی جزل کے، یہ اپیل دائر کرنے کا بنیادی مقصد متقنہ اور عدالتوں کے درمیان تعلق کو واضح کرنے کے ساتھ اعلیٰ عدلیہ کے آئینی مقام کا تعین کرنا تھا۔

مدعیان نے اپنے بیشتر درج ذیل اعتراضات میں، ۱۹۷۲ء کے عبوری آئین کی قانونی حیثیت و درستی کو چیلنج کیا کیونکہ اسی آئین کا آرٹیکل ۲۸۱، مارشل ریگولیشنز، آرڈرز وغیرہ اور اسکے کے تحت لیے گئے اقدامات جیسے انکی گرفتاری، ٹرانس و سزائوں کو آئینی تحفظ و قانونی وجود بخش رہا تھا، اور اس آرٹیکل کے خاتمے کے ساتھ ہی اسکے تمام مشکلات بھی ختم ہو سکتی تھی۔

اعتراضات یا مدعیان کے دلائل:

1. موجودہ اسمبلی کی تشکیل اور اسکے انتخاب کی بنیاد بننے والا "لیگل فریم ورک آرڈر"، جب عاصمہ جیلانی کیس کے فیصلے کے بعد کالعدم قرار پا چکا ہے، تو اسکی بنیاد پر ہونے والے الیکشن اور بننے والی اسمبلی بھی قانونی حیثیت نہیں رکھتی۔ یاد رہے لیگل فریم ورک آرڈر وہ دستاویز ہے جس کے تحت ۱۹۷۰ء کے انتخابات ہوئے، وفاقی، صوبائی اسمبلیوں کی حیثیت، اور آئین بننے کے بنیادی اصول سمیت اور بہت سے کلیدی ریاستی معاملات طے ہوئے۔

2. چونکہ ۱۹۷۰ء کے الیکشن کے تحت مشرقی و مغربی پاکستان سے منتخب کردہ ممبران قومی اسمبلی میں سے اکثریت مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کی وجہ سے، قانون ساز اسمبلی کی کاروائیوں میں

عدم شرکت کی بنیاد پر عملی طور پر اسمبلی کا حصہ نہیں رہے تھے، پس اکثریت کی غیر موجودگی میں اس اسمبلی کا ناتوجد قانونی ہے نہ ہی آئین سازی کی مجاز ہے۔

3. جب اسمبلی کا نہ وجود قانونی ہے اور نہ وہ آئین سازی کی مجاز ہے تو پھر اس کا بنایا ہوا ۱۹۷۱ء کا عبوری آئین بھی قانونی یا ایک جائز آئین کہلانے کا مستحق نہیں، اسی لیے اس آئین سے پہلے کا یعنی ۱۹۶۲ کے آئین کو جائز و نافذ العمل آئین تسلیم کیا جائے اور موجودہ اسمبلی کو آئین ساز اسمبلی کے بجائے نظریہ ضرورت کے تحت محض قانون ساز اسمبلی قرار دیا جائے جو کہ ۱۹۶۲ کے آئین میں دیے گئے ترمیم کے طریقہ کار کو استعمال کرتے ہوئے، مذکورہ آئین میں محض ترمیم کرنے اور قانون سازی کی حقدار ہو۔

4. مدعیان کی طرف سے سب سے اہم اعتراض قرارداد مقاصد، جو کہ ۱۹۷۲ کے عبوری آئین میں دیباچہ کے طور پر شامل کیا گیا تھا، کی بنیاد پر کیا گیا تھا، جس کے مطابق قرارداد مقاصد آئین سے بالاتر ایک دستاویز ہے، جس میں عوام کی امنگوں، حقوق، مستقبل کے پاکستانی آئین و ریاستی ڈھانچے کو واضح کیا گیا ہے اور چونکہ عاصمہ جیلانی کیس کے فیصلے میں اسکو پاکستان کے قانونی نظام کا بنیادی اصول³⁷ قرار دیا گیا تھا تو نہ صرف آئین سازی کے عمل میں اسکی شقوق سے روگردانی جائز نہیں بلکہ عدلیہ ۱۹۷۲ کے عبوری آئین کی وہ دفعات جیسے دفعہ ۲۸۱، جس میں قرارداد مقاصد میں درج مختلف اصولوں و بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی گئی ہو، کو کالعدم قرار دے سکتی ہیں۔ یاد رہے یا "بنیادی اصول" سے مراد کسی قانونی نظام کا وہ بنیادی اصول، قانون ہے جو اس نظام میں درج بندی کے لحاظ سے سب سے ارفع و اعلیٰ مقام پر ہوتا ہے اور اس نظام کے باقی سب قوانین و اصول اپنے جائز، قابل قبول و قانونی طور پر درست ہونے کیلئے اسکے محتاج ہوتے ہیں یعنی وہ اگر اس بنیادی اصول کے مطابق ہونگے تو درست و گرنہ وہ اس نظام میں غلط قرار پائیں گے۔

چونکہ مندرجہ بالا اعتراضات سپریم کورٹ کے ساتھ ساتھ ہائی کورٹ میں بھی دوران ساعت اٹھائے گئے تھے تو اس لیے یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ ہائیکورٹ کے پانچ رکنی بیٹچ میں سے کسی نے بھی اسمبلی کے غیر آئینی ہونے یا ۱۹۷۲ کے عبوری آئین کے بجائے ۱۹۶۲ کے آئین کے نافذ العمل ہونے کو تسلیم نہیں کیا اور صرف دو ججز

³⁷ Grund Norm

نے قرارداد مقاصد کو آئین سے بالاتر اور اسکا بنیادی اصول اہونا تسلیم کیا لیکن آرٹیکل ۲۸۱ کو پھر بھی قرارداد مقاصد کے متضادم قرار نہیں دیا۔

حکومت کے دلائل:

آگے جانے سے پہلے آرٹیکل ۲۸۱ کی متعلقہ شقوں کو دیکھنا ضروری ہے۔

اٹارنی جنرل کے مطابق آرٹیکل ۲۱۸ [۱] جنرل یحییٰ خان کے مارشل لاء کے شروعات یعنی مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ سے لیکر اسکے اختتام یعنی ۲۱ مارچ ۱۹۷۲ تک بنائے گئے جملہ قوانین بشمول مارشل لاء ریگولیشنز کو تحفظ دیتے ہوئے قرار دیتا ہے کہ یہ قوانین مجازاً اٹھارٹی نے بنائے ہیں، ان قوانین کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ہی کوئی عدالتی فیصلہ ان قوانین پر اثر انداز ہو سکتا ہے، یہاں مقصد عاصمہ جیلانی کیس کے فیصلے کا اثر ختم کرنا تھا۔

اسی طرح آرٹیکل ۲۸۱ [۲] مذکورہ بالا قوانین سے ماخوذ اختیارات کے استعمال یا مبینہ استعمال میں اٹھائے گئے تمام اقدامات اور احکامات کے اجراء کو درست قرار دینے کے ساتھ ساتھ اسکے متعلق عدالت کا اختیار سماعت بھی ختم کر رہا ہے۔

اٹارنی جنرل کا آرٹیکل ۲۸۱ [۲] کے بارے میں بنیادی موقف کچھ یوں تھا کہ مارشل قوانین کے تحت کئے گئے تمام کام جیسے گرفتاریاں، فوجی عدالتوں کا قیام، انکی سزائیں، کاروائیاں وغیرہ، چاہے توپج میں خلوص دل سے مارشل قوانین پر عمل درآمد کر کے کئے گئے ہوں یا پھر محض مارشل لاء قوانین کا سہارا لیکر بددینتی، بنا اختیار یا اختیارات سے تجاوز کر کے یعنی مذکورہ مارشل لاء قوانین کی بھی خلاف ورزی کر کے سرانجام دیے گئے، تب بھی چونکہ آرٹیکل ۲۸۱ [۲] میں "مبینہ طور پر بنایا گیا ہے، لیا گیا ہے یا کیا گیا ہے" ³⁸ کے جملے ذریعے پارلیمنٹ نے دونوں اقسام کے اقدامات کو قانونی قرار دے دیا ہے تو اب عدالت کو اقدامات کے حوالے سے کسی بنیاد پر اختیار سماعت حاصل نہیں ہے۔

اپنے اس موقف کے حق میں اٹھارنی جنرل نے متعدد فیصلوں ³⁹ کے ساتھ ساتھ برطانیہ کے نظام قانون میں پارلیمنٹ کی بالادستی، اور اسکے قانون کی حتمیت سے متعلق ڈائسی ⁴⁰ اور باقیوں کی تجاریر سمیت وہاں کے عدالتی

³⁸ "Purported to have been made, taken or done."

³⁹ پی ایل ڈی ۱۱۹۵۶ ایف۔ سی۔ ۲۰۰، پی ایل ڈی ۱۹۶۱ سپریم کورٹ ۵۸۵، پی ایل ڈی ۱۹۶۵ سپریم کورٹ ۲۲۳۔

⁴⁰ Dicey

نظائر کا سہارا لیا جن کے مطابق پارلیمنٹ کا بنایا ہوا قانون حرف آخر ہے، جس پر عدالت سے سمیت کوئی بھی انگلی اٹھانے، یا نہ ماننے کا مجاز نہیں۔

اٹھارنی جزل کے مطابق عاصمہ جیلانی کیس میں یجیسی خان کو غاصب قرار دیے جانے اور اسکے تمام اقدامات/احکامات، شروعات سے ہی کا عدم یاب ”مطل من ابتدا“⁴¹ قرار پانے، کی وجہ سے ایک آئینی بحران کے کھڑے ہونے کا اندیشہ تھا کیونکہ اس فیصلے کی وجہ سے مارشل لاء دور میں مفاد عامہ اور جمہوریت کی بحالی کیلئے لیے گئے اقدامات بھی باطل قرار پائے۔ اب اس فیصلے کے مطابق چونکہ عدالت نظریہ ضرورت کے تحت صرف مخصوص اقدامات، وہ بھی جب اسکے سامنے سماعت کے لیے لائے جاتے، معاف کر سکتی تھی، تو پارلیمنٹ نے ملک میں آئینی بحران کو روکنے کی خاطر عبوری آئین میں آرٹیکل ۲۸۱ کو شامل کیا اور وہ ایسا کرنے کی بلکل مجاز ہے۔

اسکے علاوہ اٹارنی جزل نے یہ مؤقف اپنایا کہ عدلیہ باقی ریاستی اداروں کی طرح آئین کی تابع اور اپنی طاقت و اختیار کیلئے آئین کی محتاج ہونے کی بنا پر آئین سے باہر کسی اور دستاویز، جیسے قرارداد مقاصد، کو بنیاد بناتے ہوئے، آئین کی کسی شق یا کسی قانون کو کا عدم قرار دینے کا حق نہیں رکھتی ہے۔

عدالتی فیصلہ اور دونوں اطراف کے دلائل تجزیہ:

1. کیا پاکستانی پارلیمنٹ کو ”مطل بلا دستی“⁴² اور اس کے قانون کو ”اکمل حتمیت“⁴³ حاصل ہے؟ عدالت نے سب سے پہلے برطانوی نظام قانون کی بنیاد پر پاکستانی پارلیمنٹ کیلئے بے چون و چرا کی حاکمیت و بالادستی منوانے سے متعلق اٹارنی جزل کے دلائل کو اس بنیاد پر رد کیا کہ پاکستان کا نظام قانون، ایک مدون یا تحریر شدہ آئین رکھنے کی بنا پر برطانوی نظام سے بلکل مختلف ہے، اور ایسے تمام ممالک جہاں تحریر شدہ آئین موجود ہوں، وہاں اقتدار اعلیٰ کی طاقت صرف پارلیمنٹ کے بجائے اسکے، عدلیہ اور انتظامیہ کے درمیان آئین میں دی گئی سکیم کے مطابق تقسیم ہوتی ہے اور ایسے تمام ممالک میں اقتدار اعلیٰ کے اس سہ فریقی تقسیم کے نتیجے میں فطری طور عدلیہ کا نہ صرف یہ کام ہوتا ہے کہ وہ سب کو آئین میں دیے گئے اختیارات سے تجاوز کرنے سے روکے بلکہ سب سے اونچی و آئینی عدالت ہونے کے ناطے، فطری طور پر حاصل شدہ ”آئینی نظر ثانی“⁴⁴ کے حق کو استعمال کرتے ہوئے کسی قانون، چاہے وہ قانون اسکے اختیار سماعت سے متعلق ہی کیوں نہ ہو، کی نہ صرف تشریح کر سکتی

⁴¹ Void ab initio

⁴² Absolute Sovereignty

⁴³ Finality

⁴⁴ Judicial Review

ہے بلکہ خلاف آئین ہونے کی بنیاد پر اسکو کالعدم بھی قرار دے سکتی ہے۔ اسکے علاوہ پارلیمنٹ آئینی دائرہ اختیار میں رہتے ہوئے کسی بھی قسم کی قانون سازی کرنے کا مکمل حق رکھتی ہے، یہاں تک کہ وہ کسی عدالتی فیصلے یا عدالت کو بھی قانون سازی کے ذریعے ختم کر سکتی ہے۔

2. قرارداد مقاصد کا پاکستانی قانونی نظام میں مقام کیا ہے؟

اس کے بعد عدالت نے قرارداد مقاصد کی آئین سازی و قانون سازی کے حوالے سے مبینہ مقام سے متعلق پیشتر کے مؤقف کا جائزہ لیا اور یہ قرار دیا کہ مجاز ادارے / اتھارٹی کی طرف سے قانونی طور پر منظور شدہ اور عوام کی طرف سے تائید شدہ ایک تحریری یا مدون شدہ آئین کی شق کو عدلیہ کالعدم نہیں قرار دے سکتی اور نہ ہی کوئی ایسی دستاویز جیسے کہ قرارداد مقاصد، چاہے وہ کتنی ہی اہمیت یا تقدس کی حامل کیوں نہ ہو، اگر اسکو آئین کا باقاعدہ حصہ نہیں بنایا گیا تو وہ آئین کو کنزرویو نہیں کر سکتی یعنی اسکی بنیاد پر آئین کی شق کو منسوخ نہیں جاسکتا۔ اور اگر ایسے کسی دستاویز کی کسی شق کی آئین سازی یا قانون سازی کرتے وقت خلاف ورزی کی گئی ہو جیسے کہ آرٹیکل ۲۸۱ کے حوالے سے مدعیان کا دعویٰ تھا، تو اسکو ٹھیک کرنے کا حل عدلیہ کے بجائے عوام کے پاس ہے، جس سے شاید مراد عوام کا حکمرانوں سے خود باز پرس کرنا ہے۔ یاد رہے کہ فیصلے کہ یہ چند سطور نہایت اہمیت کی حامل ہیں کیوں کہ بظاہر فیصلے کے اس اور دوسرے چند حصوں کو مد نظر رکھتے ہوئے آٹھویں آئینی ترمیم کے ذریعے جزل ضیاء الحق نے قرارداد مقاصد کو آئین کا باقاعدہ آرٹیکل ۲-۱ کے شکل میں حصہ بنایا اور بعد میں ہم نے اس سب کے اثرات حاکم خان کیس میں واضح طور پر دیکھ لیے۔ اس سب کے بنا پر عدالت نے یہ قرار دیا کہ گو کہ قرارداد مقاصد ۱۹۷۲ء کے عبوری آئین میں محض دبیاجہ کے طور پر شامل کیے جانے کی بنا پر آئین کو قابو تو نہیں کر سکتی لیکن آئین کے کسی حصے سے متعلق آئین ساز ادارے کی نیت کا پتہ لگانے کیلئے عدلیہ قرارداد مقاصد کی طرف رجوع کر سکتی ہے اور یہی ایک دبیاجہ کا اصل کام ہوتا ہے۔

آئین سازی عمل میں عوام کی مختلف خواہشات، توقعات، مطالبات کو نظر انداز کیے جانے پر عدالت نے یہ فرمایا کہ آئین سازی پر یہ سب قدغنیں قانونی کے بجائے سیاسی ہیں جنکو عدالت نہ سن سکتی ہے اور نہ اس بنا پر کسی آئینی شق کو منسوخ کر سکتی ہے بلکہ عدلیہ سیاست اور پارلیمسی سے متعلقہ معاملات سے خود کو بچا کر رکھے۔

3. کیا عاصمہ جیلانی کیس میں قرارداد مقاصد کو "بنیادی اصول" قرار دیا گیا تھا؟

اس کے علاوہ عدالت نے مدعیان اور ہائی کورٹ کے اقلیتی ججز کے اس دعویٰ کا بھی رد کیا کہ عاصمہ جیلانی کیس کے فیصلے میں سپریم کورٹ نے قرارداد مقاصد کو بنیادی اصول قرار دیا ہے بلکہ فیصلے کے متعلقہ حصوں کو بیان کر کے یہ

قرار دیا کہ عدالت نے بنیادی اصول کا لفظ قرار مقاصد کے بجائے محض اس میں درج اقتدار اعلیٰ سے متعلق ایک اصول کے تناظر میں استعمال کیا اور نہ ہی اس فیصلے میں باقی ججز صاحبان نے اپنے الگ نوٹسز قرار داد مقاصد کو بنیادی اصول قرار دیا تھا۔ مزید فرمایا کہ اگر قرار داد مقاصد کو بنیادی اصول قرار دے بھی دیا جائے تب بھی عبوری آئین کی کوئی شق اسکی خلاف ورزی نہیں کر رہی ہے۔

4. کیا عاصمہ جیلانی کیس کے بعد لیگل فریم ورک آرڈر اور الیکشن کو کالعدم سمجھا جائے؟

لیگل فریم ورک آرڈر سے متعلق عدالت نے قرار دیا کہ چونکہ یہ آرڈر جزل بیجی خان کے ان کاموں میں سے تھا جو جمہوریت، قرار داد مقاصد کے میں درج ریاست چلانے کے اصولوں اور عوام کے حقوق کی بحالی کی طرف ایک اہم قدم تھا اس لیے عاصمہ جیلانی کیس کے فیصلے میں درج طریقہ کار یعنی نظریہ ضرورت کے تحت عدالت اس اقدام کو معاف و جائز قرار دیتی ہے اور نتیجتاً اس آرڈر کے تحت ہونے والے انتخابات بھی درست قرار پائے۔

5. کیا اکثریت ممبران اسمبلی کی عدم شرکت کی بنا پر اسمبلی کا وجود یا اسکی قانون / آئین سازی کا کالعدم ہو

سکتی ہے؟

جبکہ اعتراض نمبر ۱۲ اور ۱۳ کو عدالت نے اس بنیاد پر رد کیا کہ جب تمام ممبران کو اسمبلی سیشن کے انعقاد سے متعلق نوٹسز بھیجے سمیت کسی بھی ممبر کو اس میں شرکت کرنے سے نہیں روکا گیا تھا، اور یہ بات مشرقی پاکستان سے منتخب کردہ دو ممبران کی اسمبلی کاروائی میں شرکت سے ثابت بھی ہوتی تھی، تو اکثریت ممبران کی عدم شرکت کی بنا پر اسمبلی کی حیثیت کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے بعد عدالت نے قرار دیا کہ چونکہ منتخب کردہ اسمبلی کا لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت پہلا کام آئین بنانا تھا، تو وہ آئین سازی کی مجاز تھی اور اس کام کے دوران نہ صرف لیگل فریم ورک آرڈر کے آرٹیکل ۷۷ میں درج اسمبلی کو روم پورا تھا بلکہ موجود ممبران نے متفقہ طور پر اس آئین کو منظور کیا۔

مندرجہ بالا بحث کی بنیاد پر عدالت نے مزید قرار دیا کہ جب لیگل فریم ورک آرڈر جائز قرار پا چکا ہے تو اسکی بنیاد پر ہونے والے الیکشن کے ساتھ اسمبلی کی تشکیل بھی درست قرار پائی، نتیجتاً اسکو نا صرف آئین سازی کی حقدار اسمبلی سمجھا جائے گا بلکہ اسکا منظور شدہ آئین بھی درست قرار پائے کی بنا پر نافذ العمل قرار پائے گا جسکے لازمی نتیجے کے طور پر ۱۹۶۲ء کے آئین کو منسوخ تصور کیا جائے گا یعنی عدالت نے ۱۹۶۲ء کے بجائے ۱۹۷۲ء کے عبوری آئین کو نافذ العمل تسلیم کر کے پیشتر ذکی استدعا کو مسترد کر دیا۔

6. کیا آرٹیکل ۲۸۱ قومی میں انارنی جزل کے دعویٰ کے مطابق عدالت کا اختیار سماعت ہر لحاظ سے ختم

کر رہا ہے؟

عدالت نے آرٹیکل ۲۸۱ [۱] یعنی مارشل لاء قوانین کو چیلنج سے متعلق عدالت کے اختیار سماعت کا مکمل ختم ہونے کا، اٹارنی جنرل کا دعویٰ اگرچہ تسلیم کیا لیکن آرٹیکل ۲۸۱ [۲] سے متعلق حکومتی موقف کو اس بنیاد پر رد کیا کہ آرٹیکل ۲۸۱ [۱] میں عدالت کے اختیار سماعت کو ختم کرنے کی بنیاد بننے والے دو جملوں "کسی بھی عدالت کے کسی بھی فیصلے کے باوجود"⁴⁵ اور "کسی عدالت میں نہیں بلایا جائے گا"⁴⁶، کو ۲۸۱ [۲] میں پارلیمنٹ نے استعمال نہیں کیا، اور لفظ "میدینہ"، بظاہر صرف ان اقدامات کی توثیق کر سکتا ہے یا قانونی طور پر درست قرار دلا سکتا ہے جو ویسے تو قانون کے مطابق کئے گئے ہوں لیکن ان کو کرتے ہوئی کچھ بے ضابطگی واقع ہوئی ہو لیکن مکمل طور پر بددیانتی، بنا اختیار یا اختیار سے تجاوز پر مبنی کسی اقدام کی توثیق یا اسکو قانونی قرار دینے کیلئے مذکورہ لفظ ناکافی ہے۔ پس اس بنا پر عدالت نے قرار دیا کہ عدالت کو ذیلی شق میں درج مارشل دور کے قوانین کے حوالے سے اگرچہ اختیار سماعت حاصل نہیں ہے لیکن ان قوانین کے تحت شق ۲ میں درج اقدامات کے حوالے سے اختیار سماعت حاصل ہے

آرٹیکل ۲۱۸ کی تشریح کے حوالے سے عدالت نے اپنے اس موقف کیلئے مختلف عدالتی نظائر کے علاوہ یہ دلیل دی کہ مہذب افراد پر مشتمل کوئی پارلیمنٹ بددیانتی، اختیار سے تجاوز، غیر مجاز یا غیر قانونی طور پر سرانجام دیے گئے اقدامات کو توثیق نہیں دے سکتی۔

خلاصہ:

اس کیس کا بنیادی خلاصہ یہ ہے کہ آئین کی کسی شق یا قانون کو قرار داد مقاصد یا کسی اور دستاویز چاہے وہ کتنی ہی اہم، مقدس یا آئین میں دیا چہ کے طور پر شامل کیوں نہ ہو، کو بنیاد بنا کر عدالت آئین کی کسی شق یا قانون کو کالعدم نہیں قرار دے سکتی۔ اسکے علاوہ پاکستانی قانونی نظام ایک تحریری یا مدون شدہ آئین ہونے اور اسکی وجہ سے اقتدار اعلیٰ کی طاقت عدلیہ، مقننہ و انتظامیہ کے مابین تقسیم ہونے کی وجہ سے، پارلیمنٹ کو کامل بالادستی حاصل نہیں ہے جبکہ عدالت آئینی نظر ثانی کی طاقت کا استعمال کرتے ہوئے، مقننہ کے کسی کو قانون کی نہ صرف تشریح کر سکتی ہے بلکہ آئین سے مخالفت کی بنا پر اسکو کالعدم بھی قرار دے سکتی ہے۔

⁴⁵ Notwithstanding any judgement of any court.

⁴⁶ Shall Not be called in any court.

دیوانی مقدمات میں ڈی این اے ٹیسٹ سے متعلق سپریم کورٹ کا اہم فیصلہ⁴⁷

خالد عباس⁴⁸

حقائق:

مرحوم محمد حسین نامی شخص نے مدعی کے نام ایک انتقال بہہ جاری کیا تھا جس میں مدعی کو اپنا بیٹا ظاہر کیا گیا تھا۔ مدعا علیہ جو کہ مرحوم محمد حسین کا بھتیجا ہے، نے خود کو محمد حسین کا قانونی وارث ظاہر کرتے ہوئے عدالت میں کیس دائر کیا، جس میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ محمد حسین بے اولاد فوت ہوا تھا اور مدعی نے انتقال بہہ دھوکہ دہی سے حاصل کیا ہے۔ ٹرائل کورٹ نے دونوں فریقین کی تحقیقات وضع کر دی اور شواہد قلم بند کر دیئے۔ مدعی کے شہادتوں کے بعد مدعا علیہ نے عدالت کو درخواست دی جس میں اس نے الزام عائد کیا کہ مدعی تاج دین اور اسکی بیوی زبیدہ بی بی نے کا بیٹا ہے اور الزام کے تصدیق کیلئے عدالت سے تینوں کا ڈی این اے ٹیسٹ کرنے کی استدعا کی۔ ٹرائل کورٹ نے درخواست مسترد کرتے ہوئے کہا کہ موجود شواہد کے بنیاد پر ولدیت کا پتہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ پھر مدعا علیہ نے نگران عدالت کو نظر ثانی کی درخواست دی جس پر فیصلہ کرتے ہوئے نگران عدالت نے مدعی، تاج دین اور زبیدہ بی بی کا ڈی این اے ٹیسٹ کرنے کا حکم دیا۔ مدعی نے نگران عدالت کا آرڈر ہائی کورٹ میں رٹ پٹیشن کے ذریعے چیلنج کر دیا لیکن مسترد ہوا۔ اس کے بعد مدعی نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔

سپریم کورٹ نے کیس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ یہ بات حیران کن ہے کہ نہ نگران عدالت اور نہ ہائی کورٹ کی توجہ اس جانب مبذول ہوئی کہ جو فریق مقدمے کا حصہ ہی نہیں تھے، عدالت نے انکو سنے بغیر اور کسی قانون کا حوالہ دینے بغیر ان کا دیوانی مقدمے میں ڈی این اے ٹیسٹ کا حکم دیا۔ عدالت نے دیوانی مقدمے میں کسی کے مرضی کے بغیر ڈی این اے ٹیسٹ آئین کے آرٹیکل ۱۹ اور ۱۴ کے منافی قرار دیا۔

عدالت نے یہ بھی واضح کر دیا کہ ڈی این اے ٹیسٹ نے حق آزادی اور رازداری سے متعلق کئی تشویش کھڑے کر دیئے ہیں۔ یہ انسان کی جنسی معلومات، جنسیاتی ساخت، نسل اور خاندان کا پتہ دیتی ہیں۔ مختلف شخصی اور قانونی وجوہات کے بنا پر رضامندی کے بغیر، اس ٹیسٹ کی اجازت نہیں دی جاسکتی کیونکہ آئین کے آرٹیکل ۱۴ میں دیئے گئے حق تخلیہ یعنی بنیادی انسانی حق ہے۔ یہ کسی بھی شخص کی نجی زندگی میں دوسروں کی بے جا مداخلت کو روکتا

47 دو ممبر بیچ کے اس فیصلے کو سول بیٹیشن نمبر ۲۴۱۲-۲۰۱۵ کے حوالے تحت تلاش کیا جاسکتا ہے، اور جسٹس منصور علی شاہ نے اس فیصلے کو تحریر کیا ہے۔

48 طالب علم شریعہ و قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد،

ہے۔ اسی طرح آئین کے آرٹیکل ۹ میں حق آزادی صرف مادی پابندیوں سے آزادی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ انتخاب کا بھی حق دیتا ہے۔ یہ ریاست کے بے مقصد اور من مرضی کے مداخلت سے تحفظ دیتا ہے۔ ڈی این اے کا غیر قانونی طور پر حصول انسان کی بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہیں۔ بنیادی حقوق میں مداخلت صرف قانون کے مطابق ہی کیا جاسکتا ہے جو کہ آئین کے آرٹیکل ۴ سے واضح ہیں۔ عدالت کا دیوانی مقدمات میں کسی کی اجازت کے بغیر ڈی این ٹیسٹ لینا، اس کی نجی زندگی میں مداخلت ہے البتہ فوجداری مقدمات میں وہ ایسا کر سکتی ہے۔

اس کے بعد عدالت نے اس بات کا احاطہ کرنا ضروری سمجھا کہ قانون شہادت کے آرٹیکل ۱۲۹ [جی] کے مطابق دیوانی مقدمات میں وہ شخص جس پر کسی دوسرے شخص کے ساتھ تعلق ثابت کرنے کا بار ثبوت ہو اور وہ اس ثبوت کو روکے تو عدالت ایسے شخص کے دعوے کے برعکس قیاس کر سکتی ہے اور فرض کر سکتی ہیں کہ اگر اس طرح کی شہادت بعد میں پیش کی گئی تو اس کو اس کا فائدہ نہیں پہنچایا جاسکتا لیکن عدالت کسی ایسے شخص کے متعلق قیاس نہیں کر سکتی ہے جو نہ مقدمے میں فریق ہو، نہ رضامندی ظاہر کی ہو اور نہ ہی ڈی این اے ٹیسٹ کیلئے خود کو پیش کیا ہو۔ اگر ریکارڈ پر موجود شواہد کافی ہو تو قیاس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ دیوانی مقدمات میں چونکہ فریقین اپنے دعوے کے ثبوت خود لاتے ہیں اس لئے عدالت کسی فریق کو مخالف کے تجویز کردہ طریقے سے اپنا دعویٰ ثابت کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

پھر عدالت نے اس بات پر روشنی ڈالی کہ جب کوئی شخص اپنی ماں اور کسی آدمی کی قانونی شادی کے دوران پیدا ہوا ہو اور اس آدمی نے اپنی زندگی میں کوئی اعتراض نہ اٹھایا ہو تو وہ اس کا جائز بیٹا تسلیم کیا جاتا ہے۔ اب چونکہ مرحوم محمد حسین نے اپنی زندگی میں مدعی کو قبول کرنے سے انکار نہیں کیا تھا، اس لئے اگر مدعی یہ بات ثابت کر دے کہ مرحوم محمد حسین کی بیوی راشدہ بی بی اس کی ماں ہے اور وہ دونوں کے شادی کے دوران پیدا ہوا تھا تو وہ اس کا بیٹا تصور ہو گا اور کوئی بھی شہادت بشمول ڈی این اے ٹیسٹ قانون شہادت کے آرٹیکل ۱۲۹ میں دیئے گئے قانون کی نفی نہیں کر سکتا۔

عدالت نے ایک انتہائی اہم نقطہ کی جانب توجہ بھی دلائی کہ کیس میں زیر بحث انتقال وراثت کا نہیں بلکہ بہہ کا ہے اور بہہ کسی بھی شخص کے نام جاری کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ کیس میں اہم مسئلہ یہ ہے کہ انتقال بہہ اصلی ہے یا جعلی۔ وراثت، انتقال بہہ جعلی ثابت ہونے کے بعد اہمیت کا حامل ہو گا۔ آخر میں عدالت اس نتیجے پر پہنچی کہ ٹرانس کورٹ کا آرڈر دائرہ اختیار سماعت کے مطابق تھا جبکہ مگر ان عدالت کے آرڈر کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے اور

ہائی کورٹ نے نگرانی عدالت کا آرڈر منسوخ نہ کرتے ہوئے قانونی غلطی کی جس کی تصحیح سپریم کورٹ نے پیشین کو اپیل میں بدل کر ٹرائل کورٹ کا آرڈر بحال کر دیا۔

انسداد دہشتگردی ایکٹ کے تحت نامزد جوینا کل ملزم کے ٹرائل کے حوالے سے عدالت عالیہ پشاور کا ایک اہم

فیصلہ 49

محمد ذوالقرنین ایڈووکیٹ⁵⁰

حقائق:

۷۱ سالہ سعید اللہ نامی ملزم کو پشاور کی مقامی انسداد دہشت گردی کی عدالت نے مجموعہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۲۴، ۳۳۷-۳۳۷، آرمر ایکٹ کے دفعہ ۱۱۵ اور انسداد دہشت گردی ایکٹ کے دفعہ ۷ کے تحت سزائی جس کے خلاف ملزم نے پشاور عدالت عالیہ میں دیگر وجوہات کے علاوہ اس وجہ سے اپیل دائر کی کہ ایک جوینا کل ملزم کا ٹرائل انسداد دہشت گردی کی عدالت نہیں کر سکتی جس پر پشاور عدالت عالیہ ملزم کی اپیل کو قبول کرتے ہوئے کیس کو واپس انسداد دہشت گردی کی عدالت کو ریمانڈ کیا کہ وہ اس کیس کو جوینا کل کورٹ منتقل کرے لیکن انسداد دہشت گردی کی عدالت نے ٹرائل کا دوبارہ آغاز ملزم کے خلاف چارج فریم کیا اور ساتھ ہی ساتھ ملزم کی اس استدعا کو مسترد کر دیا کہ وہ کیس کو جوینا کل کورٹ منتقل کرے جس کے بعد ملزم نے اس کے خلاف دوبارہ عدالت عالیہ سے رجوع کیا اور یہاں سے اس کیس کا آغاز ہوتا ہے۔

پشاور عدالت عالیہ کے سامنے بنیادی سوال یہ تھا کہ دہشت گردی کے دفعات کے تحت چارج کئے گئے ملزم کا ٹرائل انسداد دہشت گردی کی عدالت کرے گی اور یا پھر جوینا کل کورٹ؟

مندرجہ بالا سوال کو اپنے سامنے رکھنے کے بعد عدالت نے اپنے فیصلے کا آغاز اس بات سے کیا ہے کہ ۲۰۱۸ کے جوینا کل ایکٹ سے پہلے انسداد دہشت گردی ایکٹ کو جوینا کل جسٹس سسٹم آرڈیننس ۲۰۰۰ پر ہمیشہ مندرجہ ذیل وجوہات کی وجہ سے ترجیح دی جاتی تھی جس میں انسداد دہشت گردی ایکٹ کے دفعہ آکس میں ذکر شدہ لفظ "ایکسکلوزیبل"⁵¹ اور ساتھ ہی ساتھ ایکٹ کے ہی دفعہ ۳۲ میں ذکر شدہ ایکٹ کے باقی تمام قوانین پر رارائیڈنگ

49 یہ اہم فیصلہ جسٹس اشتیاق ابراہیم نے لکھا ہے اور اسے پی ایل ڈی ۲۰۲۳ پشاور ۱۱۰ کے طور پر تلاش کیا جا سکتا ہے۔

50 ایڈووکیٹ، پشاور بار ایسیوسی ایشن

51 Exclusively

ایکٹ⁵² کے علاوہ چند دیگر وجوہات ذکر کی ہیں اور اس کے بعد ان وجوہات کے مزید وضاحت کے لیے اعلیٰ عدالتوں کے نظائر کا ذکر کیا ہے جو کہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

جوینائل جسٹس سسٹم ایکٹ سے پہلے کے حالات اور نظائر کے بعد عدالت عالیہ نے جوینائل جسٹس سسٹم ایکٹ اور انسداد دہشت گردی ایکٹ کا تقابل کیا ہے اور تقابل کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ چونکہ دونوں قوانین میں اوور موجودہ سے تو اب فوقیت یا ترجیح کس کو حاصل ہوگی یعنی کہ یہاں پر ایک اور سوال سامنے آیا جس⁵³ رائڈنگ کلاز کے جواب کے لیے فاضل جج نے عدالت عظمیٰ کے نظائر کا سہارا لیا ہے اور یہ بات سامنے رکھی ہے کہ اس صورت میں جو قانون بعد میں بنا ہو تو اس کو فوقیت حاصل ہوگی اور اس کے بعد جسٹس صاحب نے اس بات پر زور دینے کے لئے کنونشن آن رائٹس آف چائلڈ⁵⁴ اور چند بین الاقوامی عدالتی نظائر پر بھی بحث باندھی ہے۔

یہاں تک تو یہ فیصلہ ایک عام فیصلہ تھا لیکن اس کے بعد فاضل جج نے شریعہ کی طرف رجوع کر کے عبدالقادر عودہ رح کی کتاب کے ترجمے کا سہارا لیا ہے جو کہ اس فیصلے کو انتہائی ممتاز کرتی ہے۔

مندرجہ بالا تمام امور کی وضاحت کے بعد فاضل جج نے یہ فیصلہ دیا کہ اس کیس میں دائرہ اختیار صرف جوینائل کورٹ کو حاصل ہے۔

اس انتہائی اہم کیس کا خلاصہ یہ ہے کہ دہشت گردی ایکٹ کے تحت نامزد جوینائل ملزم کا ٹرائل انسداد دہشت گردی کی عدالت کی بجائے جوینائل کورٹ کرے گی اور ساتھ ہی ساتھ جب دو سیشنز لازمیوں دونوں میں سے اوور رائڈنگ ایکٹ پاجائے تو بعد میں بننے والے قانون کو فوقیت دی جائے گی۔

Overriding effect

⁵³ Overriding Clause

⁵⁴ Convention On the Rights of Child

فوجداری مقدمات میں تفتیح ضمانت کے حوالے سے پشاور عدالت عالیہ کا ایک اہم فیصلہ⁵⁵

محمد ذوالقرنین ایڈووکیٹ⁵⁶

حقائق:

۲۳ جولائی ۲۰۲۱ کو سجاد احمد نامی مستغیث مقامی ہسپتال میں محمد رستم اور ناہیدہ بی بی کے خلاف کچھ یوں رپورٹ کرتا ہے کہ وہ یعنی سجاد احمد اپنے بھائی سرفراز کے ساتھ گاؤں کی مسجد میں نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے جا رہے تھے کہ ان کا سامنا مندرجہ بالا ملزمان سے ہوا اور ملزمان میں سے رستم نے سرفراز پر بارادہ قتل فائرنگ کی جس کے نتیجے میں وہ زخمی ہو کر گر پڑے اور اس دوران شریک ملزمہ ناہیدہ بی بی نے بھی زخمی سرفراز کے ساتھ کالم گلوچ کی اور ساتھ ہی ساتھ ان کو مارا بھی اور اس سب کی وجہ تنازعہ یہ بتائی گئی کہ سرفراز نے شریک ملزمہ ناہیدہ بی بی کو کچھ عرصہ قبل طلاق دی تھی۔ ابتدائی طور پر پولیس نے مجموعہ تعزیرات پاکستان کے زیر دفعہ ۳۲۴ مقدمہ دائر کیا لیکن بعد میں سرفراز کی زخموں کے تاب نہ لانے کے باعث چل بسنے کے بعد پولیس نے مقدمہ زیر دفعہ ۳۰۲ کر لیا تھا۔

رستم نامی ملزم ۲۳ جولائی کو واردات کے موقع سے فرار ہو گیا تھا لیکن بالآخر ۱۵ اگست کو پولیس نے اسے گرفتار کر کے بند بھالوات کیا جس کے بعد ملزم نے ایڈیشنل سیشن جج مانسہرہ کی عدالت میں ضمانت کے لئے درخواست دائر کی جو کہ ۱۰ جنوری ۲۰۲۲ کو منظور ہوئی جس کے بعد مستغیث یعنی سجاد احمد نے ایڈیشنل سیشن جج کے ضمانت دینے والے فیصلے کے خلاف پشاور ہائی کورٹ ایبٹ آباد بیٹج سے رجوع کیا اور عدالت سے ملزم کو حاصل شدہ ضمانت کی تفتیح کی استدعا کی جاتی ہے۔

پشاور ہائی کورٹ میں مستغیث یعنی شکایت کنندہ کے وکیل کی جانب سے یہ دلائل دئے جاتے ہیں کہ ملزم کو براہ راست اسلحہ آتشیں سے فائرنگ کے ذریعے سرفراز کو زخمی کرنے کے لیے چارج کیا گیا اور بعد میں ملزم کی نشاندہی پر آ کر قتل بھی برآمد ہوا لیکن اس سب کے باوجود عدالت نے ملزم کو ضمانت پر رہا کرنے کا فیصلہ دیا جو کہ سراسر اپنی من مانی پر مبنی فیصلہ ہے اور اسی لئے ملزمان کو حاصل ضمانت منسوخ کی جائے اور دلائل کے دوران شکایت کنندہ کے وکیل نے سپریم کورٹ کے فیصلوں⁵⁷ پر اٹھارہ کیا۔ شکایت کنندہ فریق کے دلائل مکمل ہونے کے بعد ملزمان کے وکیل نے عدالت عالیہ کے سامنے یہ دلائل دئے کہ ابتدائی اطلاعی رپورٹ میں ۳۰ بورپوٹول کا ذکر کیا

55 یہ اہم فیصلہ جسٹس وقار احمد نے تحریر کیا ہے اور اسے ۲۰۲۳ء کے پی ایل جے ۶۹۳ کے طور پر تلاش اور حوالہ دیا جاسکتا ہے۔

56 ریسرچ آفیسر خیبر پختونخوا ہار کونسل و ممبر قانون دان ٹیم

57 ۱۹۹۰ ایس، سی ایم، آر ۳۶، ۲۰۲۰ ایس، سی ایم، آر ۸۹، ۲۰۲۰ ایس، سی ایم، آر ۷، ۲۰۱۷ آر ۷

گیا ہے جبکہ بعد میں ملزم سے نائن ایم ایم پستول کی برآمدگی ظاہر کی گئی ہے اور اس کے علاوہ ایک گواہ کا بیان ۳۵ دن بعد ریکارڈ ہوا ہے تو اس وجہ سے یہ مزید انکوائری کا کیس ہے اور اپنے دلائل میں انہوں نے سپریم کورٹ کے دو فیصلوں⁵⁸ پر انحصار کیا۔

فریقین کے دلائل مکمل ہونے کے بعد جسٹس صاحب نے اپنے فیصلے کا آغاز اس بات سے کیا ہے کہ ریکارڈ سے یہ بات واضح ہے کہ ملزم کو براہ راست اسلحہ آتشی کے ذریعے مؤثر فائرنگ کے لیے چارج کیا گیا ہے اور پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی اس بات کو مزید تقویت فراہم کرتا ہے اور اس کیس میں چند ایک ایسے بنیادیں موجود ہیں کہ جس سے یہ لگ رہا ہے کہ ملزم اس واقعے میں ملوث ہے اور یہ کہ قتل کا جرم ضابطہ فوجداری کے ممنوعہ کار میں شمار ہونے کے باوجود صرف ایک لاکھ دو ہزار آرڈر کے ذریعے ضمانت کا فیصلہ ایک فلمی کہانی لگتی ہے اور ضمانت دینے کے لیے جس طرح کے دلائل دیے گئے ہیں تو وہ نہ صرف عجیب و غریب ہیں بلکہ وہ کسی صورت ایک عام دماغ کو بھی قابل قبول نہیں لگ رہے اور مستقل مزاجی کے اصول⁵⁹ کا استعمال بھی مکمل غلط طریقے سے کیا گیا ہے کیونکہ ایک طرف ایک خاتون ملزمہ ہے اور دوسری طرف موجودہ ملزم کو براہ راست اسلحہ آتشی کے ذریعے مؤثر فائرنگ کا کردار دیا گیا ہے اور اسی وجہ سے عدالت کو ملزم کی ضمانت قبول کرنے کے لئے کوئی بنیاد موجود نہیں تھی اور یہ کیس پر انحصار کیا کہ تمام حقائق کے خلاف فیصلہ ہے اور اس بات کے لئے جسٹس صاحب نے سپریم کورٹ کے فیصلے⁶⁰ ہے اور اس کے بعد جسٹس صاحب نے ملزم کے وکیل کی جانب سے پیش کئے جانے والے سپریم کورٹ کے ایک فیصلے کا جائزہ لے کر لکھا ہے کہ متذکرہ بالا فیصلہ خود ایک اور فیصلے پر منحصر ہے اور اس فیصلے میں تفتیح ضمانت کے لئے مندرجہ ذیل اصول بیان کیے گئے ہیں۔

1. جب ضمانت کا فیصلہ مکمل طور پر غیر قانونی اور حقائق کے مکمل خلاف ہو اور نتیجتاً وہ انصاف کا قتل ثابت ہو رہا ہو۔
2. ملزم کی جانب سے حاصل شدہ ضمانت کا کسی بھی صورت میں غلط استعمال کرنا۔
3. ملزم کی جانب سے استغاثہ کے گواہوں کی راہ میں کسی بھی طریقے سے رکاوٹ بنانا۔
4. ملزم کا عدالت کی حدود سے فرار کا خدشہ۔

⁵⁸ ۲۰۱۷ ایس، سی ایم، آر ۶۸۶، ۲۰۲۲، ۲۰۲۲ ایس، سی ایم، آر ۶۷۷

⁵⁹ Rule of Consistency

⁶⁰ ۲۰۲۲ ایس، سی ایم، آر ۸۹۶

5. تفتیش میں مداخلت کرنا۔
 6. حاصل شدہ ضمانت کا اس طرح غلط استعمال کہ اسی طرح کے ایک اور جرم میں شامل ہونا۔
 7. تفتیش کے دوران ایسے شواہد کا حصول کہ جس کے ذریعے ملزم کا جرم میں کردار ثابت ہو رہا ہو۔
- مندرجہ بالا نکات کی وضاحت کے بعد جسٹس صاحب نے پہلا نکتہ اٹھایا ہے کہ جب ضمانت دینے کا فیصلہ مکمل طور پر غیر قانونی اور حقائق کے مکمل خلاف ہو اور جس کے ذریعے انصاف کا قتل ہو رہا ہو تو ایسے میں حاصل شدہ ضمانت منسوخ کی جاسکتی ہے اور چونکہ اس کیس میں بھی ضمانت کا فیصلہ مکمل طور پر غیر قانونی اور حقائق کے خلاف ہے تو اس وجہ سے عدالت نے تفتیش ضمانت کی درخواست کو منظور کرتے ہوئے ملزم کی ضمانت خارج کرنے کا حکم دیا۔
- فیصلے کے آخر میں جسٹس صاحب نے ایک اور نہایت ہی اہم بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ملزم کو ضمانت دینے کے لئے صرف ایک لاکھ دو سو نفری جیسے کم رقم کے ذریعے ضمانت دینے کا نقصان یہ ہوگا کہ ملزم کی ٹرائل میں حاضری کو ممکن نہیں بنایا جاسکے گا اور یہی کچھ آج بھی ہوا کہ درخواست تفتیش ضمانت پر بحث کے دوران تو ملزم موجود تھا لیکن فیصلے کے وقت عدالت سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔
- تفتیش ضمانت کے اس اہم کیس کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ جب ضمانت دینے کا فیصلہ مکمل طور پر حقائق کے خلاف ہو تو وہ غیر قانونی تصور ہوگا اور ایسی صورت میں ملزم کو حاصل شدہ ضمانت کو منسوخ کیا جاسکے گا۔

مجموعہ تعزیرات پاکستان کے تحت کسی کو ریاست کے خلاف سازش اور بغاوت جیسے مقدمہ میں نامزد کرنے کے

طریقہ کار کے حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک اہم فیصلہ⁶¹

محمد ذوالقرنین ایڈوکیٹ⁶²

نوٹ :: یاد رہے کہ یہ وہ مشہور زمانہ کیس ہے جس میں پاکستان تحریک انصاف کے رہنماء شہباز گل کو اے آر وائی چینل پر براہ راست نشریات میں ریاست کے خلاف سازش اور بغاوت کا مرتکب قرار دے کر گرفتار کر دیا گیا تھا اور ان کے ساتھ بعد میں موجودہ کیس کے درخواست گزار عماد یوسف جو کہ بنیادی طور پر اے آر وائی کے شعبہ نیوز کے سربراہ ہیں کو بھی مقدمے میں نامزد کر کے گرفتار کر دیا گیا تھا۔

⁶¹ یہ اہم فیصلہ سپریم کورٹ کے فاضل جج، جسٹس جمال مندوخیل صاحب نے تحریر کیا ہے۔

⁶² ایڈوکیٹ، پشاور ہار ایسوسی ایشن۔

حقائق:

۱۸ اگست ۲۰۲۲ کو اے آر وائی نیوز کے ایک پروگرام میں شہباز گل نے ایک سوال کے جواب میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کیا کہ جو اسلام آباد کے ایگزیکٹو مجسٹریٹ کی نظر میں مجموعہ تعزیرات پاکستان کے تحت سنگین جرائم میں شمار ہوتا ہے اور اسی وجہ سے مجسٹریٹ صاحب نے ڈپٹی کمشنر اسلام آباد سے شہباز گل کے خلاف ایف آئی آر درج کرانے کی اجازت طلب کی جس کے جواب میں ڈپٹی کمشنر نے چیف کمشنر اسلام آباد سے رہنمائی طلب کی جنہوں نے سیکرٹری داخلہ سے اجازت کی درخواست کی اور یوں سیکرٹری داخلہ سے اجازت ملنے کے بعد مجسٹریٹ صاحب نے شہباز گل وغیرہ کے خلاف اسلام آباد کے تھانہ کوہسار میں مجموعہ تعزیرات پاکستان کے دفعات ۱۲۰-بی، ۱۲۱-اے، ۱۲۳، ۱۳۱، وغیرہ کے تحت ایف آئی آر درج کرا دی۔ یاد رہے کہ اسی ایف آئی آر کے تحت موجودہ درخواست گزار عماد یوسف کو اس وجہ سے نامزد کیا گیا کہ انہوں نے بحیثیت ڈائریکٹر نیوز مرکزی ملزم یعنی شہباز گل کے ساتھ مل کر سازش کی ہے۔ استغاثہ کی جانب سے ایڈیشنل سیشن جج اسلام آباد کے پاس چالان جمع کرنے کے بعد اس سے پہلے کہ ٹرائل کا آغاز ہوتا کہ موجودہ درخواست گزار نے درخواست بریت اس وجہ سے جمع کی کہ ٹرائل کورٹ کے پاس اختیار ساعت نہیں ہے اور اسی لئے یہ بھی درخواست کی کہ ان پر فرد جرم نمائندگی جائے لیکن ایڈیشنل سیشن جج نے درخواست گزار کی بریت کی درخواست خارج کر دی اور اس کے ساتھ اسلام آباد ہائی کورٹ نے بھی ایڈیشنل سیشن جج کے فیصلے کے خلاف نظر ثانی کی درخواست خارج کر دی اور یوں اس کیس کا آغاز سپریم کورٹ میں بحیثیت لیوٹو اپیل ہو جاتا ہے۔

سپریم کورٹ نے فریقین کے دلائل سننے کے بعد اپنے بحث کی ابتداء ضابطہ فوجداری کے باب بائیس-اے سے کیا ہے جس کی پاسداری مقننہ نے اس لئے لازمی رکھی ہے کہ اس کی وجہ سے ملزمان کے منصفانہ حق ساعت کا حصول ممکن ہو اور کسی ملزم کے خلاف فرد جرم نمائندگی کا تعلق بھی اسی باب سے ہے۔ عدالت نے یہاں پر فوجداری مقدمات کا ایک اہم اصول ذکر کیا ہے کہ ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۲۶۵-ڈی کے تحت عدالت فرد جرم صرف اس صورت میں دائر کرے گی جب عدالت ایف آئی آر، پولیس رپورٹ، گواہوں کے بیانات کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اس عدالت کو اختیار ساعت حاصل ہے اور بظاہر ملزم کے خلاف ٹرائل چلایا جاسکتا ہے تو صرف اس صورت میں ملزمان کے خلاف فرد جرم نمائندگی و گرنہ بصورت دیگر نہیں۔ اس انتہائی اہم اصول کی صراحت کے ساتھ وضاحت کے بعد عدالت نے ضابطہ فوجداری کے ایک اور اہم اصول یعنی ضابطہ فوجداری کے تحت بریت کی

کی تشریح کچھ یوں کی ہے کہ کسی بھی ⁶³ "درخواست کب دی جاسکتی ہے اور اس بابت عدالت نے" کسی بھی سٹیج سٹیج سے مراد یہ ہے کہ بریت کی درخواست نہ صرف فرد جرم عائد ہونے کے بعد دی جاسکتی ہے بلکہ فرد جرم عائد ہونے سے پہلے بھی دی جاسکتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ اصول بھی ذکر کیا ہے کہ عدالت اس اختیار کا استعمال خود بھی کر سکتی ہے لیکن اس اختیار کا استعمال کرنے سے پہلے فریقین کو دلائل دینے کا موقع ملانا لازمی ہے۔ اس کے بعد عدالت نے مقننہ کی جانب سے عدالتوں کو یہ اختیار دینے پر ایک مفصل بحث کی ہے جو کہ پڑھنے لائق ہے۔

ضابطہ فوجداری کے مندرجہ بالا اصولوں کے ذکر کے بعد عدالت موجودہ کیس کی طرف واپس آئی ہے اور لکھا ہے کہ چونکہ درخواست گزار کے خلاف جو الزامات ہیں تو وہ ریاست کے خلاف بغاوت اور سازش سے متعلق ہیں اور کسی کو ایسے الزامات میں نامزد کرنا اور پھر کارروائی کرنے کے لئے مقننہ نے مجموعہ تعزیرات پاکستان کے دفعہ ۱۹۶ میں پورا طریقہ کار موجود ہے جس کے مطابق عدالت کسی کے خلاف ایسے الزامات کی موجودگی میں صرف اس وقت کارروائی کر سکتی ہے جب شکایت وفاقی یا صوبائی حکومت یا پھر ان کی طرف سے نامزد کوئی اور بندہ کرے۔ اس کے بعد عدالت نے آئین پاکستان کے آرٹیکل ۱۹۰ اور ۱۳۷ کے تحت وفاقی اور صوبائی حکومت کی تعریف بیان کرنے کے بعد ایک زبردست قانونی دلیل کا سہارا لیا ہے کہ جس کے مطابق کسی کے پاس اگر خود تفویض کردہ اختیار ہو تو وہ آگے کسی اور کو نہیں کر سکتا۔ یہاں پر یاد رہے کہ حکومت نے ایک نوٹیفکیشن کے ذریعے سیکرٹری داخلہ کو وفاقی حکومت کی جانب سے شکایت کرنے کے لیے نامزد کیا ہے لیکن موجودہ کیس میں سیکرٹری داخلہ نے چونکہ خود شکایت نہیں کی ہوتی ہے بلکہ انھوں نے اپنے تفویض کردہ اختیار کو مزید آگے تفویض کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ مجموعہ تعزیرات پاکستان کے دفعہ ۱۹۶ کو واضح کیا ہے کہ جس کے مطابق کسی کے خلاف ایسے شکایت کی صورت میں ایف آئی آر نہیں بلکہ جوڈیشل مجسٹریٹ کے پاس شکایت جمع کرنی ہوتی ہے اور جوڈیشل مجسٹریٹ انکو آری کے بعد اگر سمجھے کہ الزامات بے بنیاد ہیں تو دفعہ ۲۰۳ کے تحت خارج کر دے گا اور اگر جوڈیشل مجسٹریٹ کو لگے کہ ٹرائل چلانا چاہیے تو پھر باب ۱۷ میں موجود طریقہ کار کے مطابق کارروائی کا آغاز ہوگا۔ اس کے بعد عدالت نے مقننہ کی جانب سے یہ خصوصی طریقہ کار دینے کی اہمیت اور ایگزیکٹیو اور جوڈیشل مجسٹریٹ کے درمیان فرق پر ایک بحث باندھی ہے۔

⁶³ At any Stage

مندرجہ بالا باتوں کی وضاحت کے بعد عدالت نے ایک اور اہم اصول کا ذکر کیا ہے کہ جس کے مطابق قانون میں اگر کسی کام کے کرنے کا ایک طریقہ کار موجود ہے تو یہ لازمی ہے کہ اس طریقہ کار کو اختیار کیا جائے اور چونکہ مجموعہ تعزیرات پاکستان کے تحت ایسے الزامات کی صورت میں طریقہ کار یہ ہے کہ شکایت وفاق حکومت، صوبائی حکومت یا ان کے نامزد کردہ کسی نمائندہ کی جانب سے ہو اور شکایت میں یہ بات لازمی ہے کہ یہ شکایت کس کے خلاف ہے اور الزامات کی پوری تفصیل ذکر کرنا بھی لازمی ہے اور عدالت شکایت موصول ہونے کے بعد انکو آزمائی کرے گی جس کے بعد اگر عدالت مندرجہ بالا اصولوں کی روشنی میں مناسب سمجھے تو فرد جرم عائد کرے اور قانونی کارروائی کا آغاز کرے لیکن اگر عدالت اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ بے بنیاد ہے یا طریقہ کار کو اختیار نہیں کیا گیا تو عدالت کے لئے اپنے خصوصی اختیارات کا استعمال لازمی ہے اور اگر عدالت اپنے اختیارات کا استعمال نہیں کرتی تو یہ خلاف قانون ہو گا۔ اس خوبصورت بحث کے بعد عدالت ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے مزید لکھتی ہے کہ عدالتیں شہریوں کے خلاف بے بنیاد اور غیر قانونی عدالتی کارروائی کا آلہ کار بننے کی بجائے اپنے اختیارات کو بغیر کسی خوف و خطر کے استعمال میں لائے اور اگر عدالتیں ایسا نہیں کرتی تو یہ عدالتوں کے وقار، آزادی اور غیر جانبداری کے خلاف ہو گا اور اس کی وجہ سے لوگوں کا عدالتوں پر سے اعتماد ختم ہو جائے گا۔

عدالت نے اس کے بعد آئین کو ایک مقدس دستاویز اور عمرانی معاہدہ قرار دیتے ہوئے آئین کے ابتدائی سے ایک خوبصورت بحث کا آغاز کچھ یوں کیا ہے کہ آئین کے مطابق ریاست اپنے اختیارات کا استعمال عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے کرے گی اور ریاست کے ہر شہری کو سیاسی و سماجی انصاف، آزادی اظہار رائے کا حق حاصل ہے اور شہریوں کے ان حقوق کے تحفظ کی خاطر ریاست اپنے اختیارات کا استعمال آئین کے مطابق کرے گی۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا عوام تک معلومات پہنچانے کے بنیادی ذرائع ہیں لیکن اس حق کے استعمال کی وجہ سے سیاسی رہنماؤں، سیاسی کارکنان، انسانی حقوق کے علمبرداروں، صحافیوں اور کئی کیسیز میں تو ان افراد کے خاندان کے خلاف بھی سیاسی ایف آئی آر ذریعہ کی گئی اور اس بات پر یقین کرنا نہایت ہی مشکل ہے کہ کیسے کوئی عوامی نمائندہ، سیاسی رہنما یا صحافی ریاست کے خلاف اقدامات میں ملوث ہو سکتے ہیں اور ریاست کی جانب سے ایسے اقدامات شہریوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم رکھنے کے مترادف ہے اور ایسے اقدامات کی وجہ سے شہریوں میں عدم تحفظ پھیل جاتا ہے جس کا نتیجہ ریاستی اداروں کے خلاف نفرت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ جمہوری حکومت تو بنیادی طور پر وہ ہوتی ہے جس میں عوام کی حکمرانی، عوام کے لئے ہے اور اسی لئے حکومت کو بجائے

اپنے اختیارات کے غلط استعمال کے عوام کی مرضی و منشا کو قبول کرنا چاہیے تاکہ عوام کا اداروں پر بڑھتے ہوئے نفرت اور عدم اعتماد کو کم کیا جاسکے۔

مندرجہ بالا امور کی صراحت کے ساتھ وضاحت کے بعد عدالت ایک مرتبہ پھر کیس کی طرف واپس آئی ہے اور لکھا ہے کہ چونکہ موجودہ درخواست گزار ایک تو ایف آئی آر میں نامزد نہیں ہوتا بلکہ تفتیش کے دوران تفتیشی افسر اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ درخواست گزار بھی مرکزی ملزم کے ساتھ سازش میں شریک ہے اور درخواست گزار کے خلاف ثبوت صرف ایک ٹرانسکرپٹ ہے جو مبینہ طور پر مرکزی ملزم کی نشاندہی پر اس کے گھر سے برآمد ہوا جس کی اصلیت کے حوالے سے درخواست گزار صراحت کے ساتھ انکار کر چکے ہیں اور چونکہ مرکزی ملزم کا اے آر وائی پرائیوٹ نیٹ ورک براہ راست تھا تو پھر کیسے موجودہ درخواست گزار کو مجرم گردانا جاسکتا ہے اور چونکہ قانون کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ ہر شخص صرف اپنے کئے کا جواب دہ ہے تو اسی لئے موجودہ درخواست گزار کو مورد الزام ٹھہرانا غلط ہے۔ مندرجہ بالا باتوں کی روشنی میں عدالت نے میٹیشنرز کی لیوٹوائیل کو اپیل میں تبدیل کر کے منظور کرتے ہوئے عدالت عالیہ اسلام آباد اور ایڈیشنل سیشن جج اسلام آباد کے فیصلے کا عدم قرار دے کر میٹیشنرز کو تمام الزامات سے بری قرار دے دیا۔

ملزم کی جانب سے آلہ قتل کی برآمدگی کا باعث بننے والے اعترافی بیان کی قانونی حیثیت کے حوالے سے پشاور ہائی

کورٹ کا ایک اہم فیصلہ⁶⁴

طاہر خان وزیر

اس کیس میں عدالت کے سامنے بنیادی سوال یہ تھا کہ پہلے سے تیار شدہ نقشہ وقوعہ کی صورت میں ملزم کا دوران حراست ایسا انکشاف جو آلہ قتل کی برآمدگی کا نتیجہ بننے کی قانونی حیثیت کیا ہوگی؟

قانون کہتا ہے کہ ملزم کا دوران حراست بیان یا انکشاف اس کے خلاف نہیں ہے۔ ایسے انکشاف کو ملزم کے خلاف استعمال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ: یہ اسی نسبت سے برآمدگی کا نتیجہ بنے، اس کا پولیس کو پہلے سے معلوم نہ ہو، برآمدگی اور جرم کے مابین لازمی ربط ہو۔

کیس کے حقائق:

⁶⁴ اس فیصلے کو فوجداری اپیل نمبر ۸۳-۱۱۱۱-۲۰۲۲ کے تحت ڈاؤن لوڈ کیا جاسکتا ہے۔

گل مینہ گاؤں میں قتل ہوتی ہے۔ مقتولہ کاشوہر، جو وقوعہ کے وقت بازار میں تھی، گھر آکر گل مینہ کے بھائی بختی مند کو قتل کا زمہ دار ٹھہراتا ہے۔ وجہ یہ بتاتا کہ چون کہ ان کی اور گل مینہ کے مابین پسند کی شادی ہوئی تھی جس کی وجہ سے گل مینہ کے بھائی ان دونوں کو دھمکیاں دیا کرتا تھا۔ یہ بیان مقتولہ کاشوہر ۲۶ جولائی ۲۰۲۰ کو پولیس کو دیتا ہے۔ مقتولہ کاشوہر ۲۹ جولائی ۲۰۲۰ کو اپنی پچھلی بیان سے ہٹ کر سگی بہن مسماہ رانا ز کو ملزمہ ٹھہراتا ہے۔ کارڈ آف اریسٹ کے مطابق ملزمہ ۳۰ جولائی ۲۰۲۰ کو گرفتار ہوتی ہے اور اسی دن اسے مجسٹریٹ ان کا اعترافی بیان ریکارڈ کرتے ہے۔

مجسٹریٹ ملزمہ (ایک نوجوان اور انپڑھ عورت) کا اعترافی بیان ۱۵ منٹ کے اندر ٹائپ کر کے ریکارڈ کرتا ہے۔ واضح رہے مجسٹریٹ کے سامنے اس اعترافی بیان کے سپورٹ میں کوئی غیر جانبدار اور مضبوط ثبوت نہ تھے۔ مجسٹریٹ اسی اعترافی بیان کے بنیاد پر ملزمہ کو عمر قید کی سزا سناتا ہے۔

رانا ز اس فیملہ کو پشاور ہائی کورٹ کے سامنے چیلنج کرتی ہے۔ عدالت کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے یہ دیکھتی ہے کہ

- رانا ز کے اعترافی بیان کی صحت اور قانونی پوزیشن کیا ہے؟
- بیان ریکارڈ کرتے ہوئے ملزمہ کو سوالات سمجھنے کا موقع دیا گیا کہ نہیں؟ اس سے پہلے وہ کہاں تھی؟
- پہلے سے تیار شدہ نقشہ و وقوعہ کی صورت میں دوران حراست ملزمہ کا انکشاف اور اس کی نسبت سے برآمدگی کی کیا حیثیت ہے؟ کیا اس کو ملزمہ کے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے کہ نہیں؟

اچھی طرح واضح رہے کہ عدالت کے سامنے یہ تسلیم شدہ حقیقت تھی نقشہ و وقوعہ ملزمہ کے گرفتاری سے پہلے کی تیار کی گئی تھی۔

عدالت ملزمہ کا بیان دیکھتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ملزمہ ۳۰ جولائی کو نہیں بلکہ ۲۹ جولائی کو پولیس کے حراست میں آئی تھی۔ یعنی اعترافی بیان ریکارڈ کرنے سے ایک دن قبل پولیس کی حراست میں تھی؛ دست یاب ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹرائل کورٹ نے ملزمہ کا بیان پندرہ منٹ کے اندر ریکارڈ کیا؛ ملزمہ نے سوالنامے پر سوال نمبر ۱۱ کو جواب میں مہیہ اعترافی بیان کو اعلا کہا ہے جس کو ٹرائل کورٹ نے نہیں دیکھا؛ ٹرائل کورٹ نے ملزمہ کو ہسٹول کہاں سے ملا۔ کا سوال بھی نہیں پوچھا، یہ بھی نہیں دیکھا کیا خواتین کے مابین گھر بلو لڑائیاں ایک چھوٹی عمر کی لڑکی کو اس قدر سنگین جرم کے ارتکاب پر اکسا بھی سکتی ہے کہ نہیں، ٹرائل کورٹ نے اس پہلو کو بھی نظر انداز کیا کہ نقشہ و وقوعہ ملزمہ کی گرفتاری سے پہلے کا بنایا گیا ہے جس پر وقت کا ذکر نہیں ہے۔

مندرجہ بالا پوزیشن کو دیکھ کر عدالت نے قرار دیا کہ

1. ملزمہ کے اعترافی بیان رضامندی سے لیا گیا ہے کہ نہیں کا پہلو ٹرائل کورٹ نے نظر انداز کر دیا ہے۔
 2. مجسٹریٹ نے اس امر کو بھی نظر انداز کیا ہے کہ ملزمہ پولیس کے سامنے دی گئی مبینہ اعترافی بیان سے روگردانی کر رہی ہے جو کہ سوالنامے پہ سوال نمبر ۱۱ کو جواب سے واضح ہے۔
 3. مجسٹریٹ نے ملزمہ کو سوالات سمجھنے کا موقع نہیں دیا۔ مجسٹریٹ نے جوابات ۵ امنٹ کے اندر ریکارڈ کیے جس کا مطلب یہ ہے کہ ملزمہ کو سوالات کو سمجھنے کا مناسب وقت نہیں دیا گیا۔
 4. مجسٹریٹ نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ: کیا ملزمہ پستول چلانے کی صلاحیت رکھتی تھی؟ اس کو پستول کہاں سے ملا؟ اس نے پستول چلانا کہاں سے سیکھا؟ کیا خواتین کے مابین گھریلو لڑائیاں اتنی کم سن بچی کو اس قدر سخت فیصلے پر اکسا سکتی ہے؟ گھر کے بڑے بالعموم ایسے معاملات میں مداخلت کرنے معاملہ کو سلجھا دیتے ہے، اس کیس میں ملزمہ کی ماں دوران وقوعہ موجود تھی۔
 5. ملزمہ کی نشان دہی اور اس سے منسوب برآمدگی کو ملزمہ کے خلاف استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ ناتوثقہ پہ ملزمہ کی جانب سے نشان دہی کا نام نہیں لکھا ہوا ہے؛ یہ نقشہ و قوعہ ملزمہ کی گرفتاری سے پہلا تیار کیا گیا ہے؛ جو کچھ مبینہ طور پر ملزمہ نے پولیس کو بتایا ہے [جس کے نتیجے میں پستول برآمد ہوا ہے] اس کا پولیس کو پہلے سے معلوم تھا۔ اس برآمدگی کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔ اس کو ملزمہ کے خلاف استعمال کرنا قانون شہادت کی صریح خلاف ورزی ہے۔
- عدالت نے مندرجہ وجوہات کی بنا پر ملزمہ کی سزا کو کالعدم کر دی۔

سیاسی پناہ یعنی اسلام کی غرض سے اپنی جان بچانے کی خاطر غیر قانونی طور پر پاکستان میں داخل ہونے والے افراد کے حوالے سے اسلام آباد ہائی کورٹ کا ایک اہم فیصلہ⁶⁵

محمد ذوالقرنین ایڈووکیٹ⁶⁶

حقائق:

راہل عزیزی نام کی ایک افغان پناہ گزین جو کہ پانچ سال افغانستان پولیس میں اپنے فرائض منصبی سرانجام دینے کے بعد ۲۰۲۱ء کے اواخر یعنی اگست میں حکومت کی تبدیلی کے باعث اپنی جان بچانے کی غرض سے غیر قانونی طور پر یعنی بغیر کسی دستاویزات کے پاکستان میں داخل ہوتی ہے جہاں پر وہ خود کو اسلام آباد پولیس کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے جس کے بعد اسلام آباد پولیس ان کو اسسٹنٹ کمشنر کے سامنے پیش کرتی ہے اور وہ راہل کو دارالامان بھیجے گا حکم صادر فرماتے ہیں اور اس کے بعد راہل کے خلاف ایف آئی اے کی جانب سے فارنزز ایکٹ کے دفعہ ۱۴ کے تحت ایف آئی آر کا اندراج کیا جاتا ہے اور یوں وہ اڈیالہ جیل پہنچ جاتی ہے۔ ایف آئی آر کے اندراج کے بعد اسلام آباد ہائی کورٹ سے راہل کی درخواست ضمانت منظور ہوتی ہے اور ان کو سیکرٹری داخلہ کے حوالے کیا جاتا ہے اور وہ ان کو [یو، این۔ ایچ، سی آر] کے حوالے اس لئے کرتے ہیں کہ ایک تو فارنزز ایکٹ کے دفعہ ۱۴ کے تحت ان کا ٹرائل مکمل ہو سکے اور دوسرا تا کہ وہ اپنے پناہ گزینی یعنی اسلام کی درخواست پر پیش رفت کر سکے۔ یاد رہے کہ اس کے بعد راہل عزیزی کی حکومت آسٹریلیا کی جانب سے نہ صرف اسلام کی درخواست منظور ہوتی ہے بلکہ ان کو ویمن ایٹ رسک "ویزا بھی عطا کر دیتی ہے جو کہ راہل عزیزی کو اس بات کی حقدار بنا دیتی ہے کہ وہ تاحیات آسٹریلیا میں قیام کر سکے لیکن یہاں سے کہانی میں ایک نیا موڑ آتا ہے اور وہ یہ کہ آسٹریلیا جانے کے لئے راہل عزیزی کو پاکستان سے اخراج کے لئے ایک "ایگزٹ سرٹیفکیٹ" چاہئے ہوتا ہے لیکن حکومت پاکستان اس وجہ سے راہل عزیزی کو سرٹیفکیٹ دینے سے انکار کر دیتی ہے کہ ان کے خلاف فارنزز ایکٹ کے دفعہ ۱۴ کے تحت ٹرائل چل رہا ہوتا ہے۔ جس کے بعد راہل عزیزی مجسٹریٹ کی عدالت میں ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۵۵۰-اے کے تحت بریت کی درخواست دیتی ہے لیکن ان کی نہ صرف وہ درخواست خارج ہو جاتی ہے بلکہ نظر ثانی کی درخواست بھی خارج کر دی جاتی ہے جس کے بعد راہل عزیزی اسلام آباد کی عدالت عالیہ سے رجوع کرتی ہے اور وہاں پر یہ

65 یہ اہم فیصلہ جسٹس بابر ستار نے لکھا ہے اور اسے ۲۰۲۳ء کے رٹ بیٹیشن نمبر ۱۶۶۶ کے طور پر تلاش کیا جاسکتا ہے۔

66 ریسرچ آفیسر؛ خمیر پختو خواہار کونسل

درخواست کرتی ہے کہ ان کے خلاف درج ایف آئی آر ختم کر دی جائے اور ساتھ ہی ساتھ مجسٹریٹ اور ایڈیشنل سیشن جج کے فیصلوں کو بھی کالعدم قرار دیا جائے اور یوں اس کیس کا عدالت عالیہ میں آغاز ہوتا ہے۔

یاد رہے کہ اسلام آباد کے عدالت عالیہ کے سامنے سوال یہ تھا کہ کیا راول عزیزی کو پاکستان سے اخراج کی اجازت ایف آئی آر کے خاتمے کے بعد دی جائے یا پھر ان کو مکمل ٹرائل کا سامنا کرنے کے بعد اجازت دی جائے؟ یاد رہے کہ مجسٹریٹ اور ایڈیشنل سیشن جج نے اس وجہ سے راول عزیزی کی درخواست بریت خارج کی تھی کہ راول عزیزی کو جو اسلٹم کی متلاشی ہونے کا سرٹیفکیٹ ایف آئی آر کے اندراج کے دو مہینے بعد ملا تھا جو کہ اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ راول عزیزی پاکستان میں غیر قانونی طور پر داخل ہوئی تھی۔

نوٹ: یاد رہے کہ فیصلے کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ راول عزیزی کی درخواست ضمانت کے موقع پر عدالت نے حکومت سے مہاجرین کو اسلٹم کا حقدار قرار دینے اور نہ دینے کے طریقہ کار بابت رپورٹ مانگی تھی جس کا خلاصہ اس فیصلے میں مذکور ہے اور اس بابت عدالت عالیہ کے جسٹس بابر ستار صاحب کی بحث اس فیصلے کو چار چاند لگا دیتی ہے۔

عدالت عالیہ کی جانب سے سوال کی وضاحت کے بعد مسماٹ راول عزیزی کے وکلاء کی جانب سے اپنی بحث کا آغاز اس نکتے سے ہوتا ہے کہ چونکہ فارز ایکٹ کے دفعہ ۱۴ کی خلاف ورزی بنیادی طور پر ایک فوجداری کیس ہے اور فوجداری کیس کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ جرم کی تکمیل کے لئے ملزم کا ارادہ یعنی نیت بھی شامل ہو اور چونکہ اس کیس میں ملزم راول عزیزی اپنی جان بچانے کی غرض سے پاکستان آئی اور پھر یہاں بھی غیر قانونی طور پر رہنے کی بجائے اسلٹم سرٹیفکیٹ لیا اور مزید برآں حکومت آسٹریلیا کی جانب سے ان کو اسلٹم مل بھی گیا اور یہ کہ آئین پاکستان ہر اس شخص کو آزادی دیتا ہے جو کہ پاکستان میں ہوں جن میں مہاجرین بھی شامل ہیں جبکہ دوسری طرف حکومت کی جانب سے اسسٹنٹ انارنی جنرل صاحب نے کہا کہ حکومت کو کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن چونکہ راول عزیزی کے خلاف ایک فوجداری مقدمہ چل رہا ہے تو اس وجہ سے وزارت داخلہ ایگزٹ سرٹیفکیٹ جاری نہیں کر سکتا۔

عدالت نے فریقین کے دلائل سننے کے بعد سب سے پہلے اس نکتے کا رخ کیا ہے کہ پاکستان میں ایسا کوئی قانونی نظام نہیں ہے جس کے تحت مہاجرین کی کوئی پہچان یا ان کو اسلٹم دینے کا طریقہ کار موجود ہو اور یہ کہ پاکستان مہاجرین کنونشن کا دستخط کنندہ بھی نہیں ہے۔ یہاں سے جسٹس صاحب نے بین الاقوامی معاہدوں اور اس کے پاکستانی نظام قانون میں عمل درآمد پر ایک خوبصورت بحث باندھی ہے۔ اور اس سب کے بعد اس بحث پر آئے ہیں کہ جب ایک

مرتبہ راہل عزیز کی کوہما جرح ہونے کا سٹیٹس اور اس کو آسٹریلیا کی جانب سے اسٹلم اور تاحیات ویزا بھی مل گیا تو کیا ریاست کے لئے لازمی ہے کہ وہ اس کا ٹرائل کرے؟ اور یہاں سے جسٹس صاحب نے بحث کارخ فارنرز ایکٹ کے دفعہ ۱۴ کی طرف موڑ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس قانون کا مقصد کسی کو سزا نہیں دینا نہیں بلکہ پاکستان میں باہر سے آمد و رفت کو منظم کرنا ہے اور اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ کوئی غیر ملکی کسی غیر قانونی کام کی غرض سے داخل نہ ہو اور اس کے بعد ایک اور خوبصورت بحث باندھ کر جسٹس صاحب نے یہ ثابت کرنے کی جرائم میں شمار نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ فارنرز ایکٹ کے 67 کو کوشش کی ہے کہ یہ جرم سٹرکٹ لیا بیلٹی دفعہ ۱۴ کے تحت نہ صرف پاکستان میں غیر قانونی پر داخل ہونا ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ جرم کی تکمیل کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ آپ پاکستان جرم کی نیت سے آئے ہوں اور اگر کوئی صرف اپنی جان بچانے کی غرض سے پاکستان آئے تو یہ جرم شمار نہیں ہوگا۔ اس فیصلے میں ایک اور خوبصورت بحث اس بابت بھی باندھی گئی ہے کہ فارنرز ایکٹ کے دفعہ ۱۴ کو آئین پاکستان میں موجود بنیادی انسانی حقوق کی روشنی میں پڑھا جائے گا۔

اس انتہائی اہم فیصلے کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی غیر ملکی شہری کسی غیر قانونی طریقے سے پاکستان میں اپنی جان بچانے کے لیے داخل ہو اور اس کا پاکستان آنے کا مقصد قطعی طور پر کسی غیر قانونی کام کے لئے نہ ہو تو ایسی صورت میں یہ جرم نہیں سمجھا جائے گا اور اسی کو دیکھتے ہوئے عدالت عالیہ نے راہل عزیز کی مقدمے سے بری کرتے ہوئے حکومت سے ان کو ایگزٹ سرٹیفکیٹ فوری طور پر جانے کا حکم دیا۔

پشاور ہائی کورٹ کا ۱۳-۱۳-پی۔ او کے تحت گرفتار سیاسی کارکنان کے کیس میں ۳۱-پی۔ او اور آئین پاکستان کے آرٹیکل ۲۴۵ کے اہمیت کے حوالے سے اہم فیصلہ⁶⁷

طاہر خان وزیر

عدالت کے سامنے بنیادی سوال یہ تھا کہ کیا آرٹیکل ۲۴۵ کی صورت میں آرٹیکل ۱۹۹ معطل ہو جاتا ہے؟

⁶⁷ Strict Liability: Strict liability is a concept applied in both civil and criminal law that holds a defendant responsible for their actions regardless of their intent at the time of the action.

⁶⁸ یہ اہم فیصلہ جسٹس سید راشد علی نے تحریر کیا ہے اور اسے ۲۰۲۳ کے پی ایل جے ۹۷۰ کے طور پر تلاش اور حوالہ دیا جاسکتا ہے۔

کیس کے حقائق کیا ہے یہ جاننے سے پہلے تھری ایم۔ پی۔ او اور آرٹیکل ۲۴۵ کو سمجھنا ضروری ہے۔ ایم۔ پی۔ او کے تحت حکومت جرم کے ارتکاب کے خدشہ پر کسی شخص کو گرفتار کر سکتا ہے۔ آئین کا آرٹیکل ۲۴۵ کہتا ہے کہ وفاقی حکومت کی منظوری سے سول انتظامیہ کی مدد کے لیے فوج تعینات کی جاسکتی ہے۔ تاہم جس علاقے میں فوج طلب کر لی جائے اس علاقے میں ہائی کورٹ دفعہ ۱۹۹ کے تحت اختیارات استعمال نہیں کرے گی۔ آرٹیکل ۲۴۵ ذیلی دفعہ ۳ کو [اوسٹر کلاز⁶⁹] کہتے ہیں کیوں کہ یہ ہائی کورٹ کی اختیار سماعت کو ایک خاص مدت کے لیے ختم کر دیتا ہے۔

حقائق:

سابق وزیر اعظم عمران خان صاحب کی اسلام آباد ہائی کورٹ سے رہنمائی کے ہاتھوں گرفتاری کے بعد ملک میں پیدا ہونے والی لاء اینڈ آرڈر حالت کی وجہ سے خیبر پختونخوا حکومت کی درخواست پر آرٹیکل ۲۴۵ کے تحت فوج تعینات کی گئی۔ اس گرفتاری کے بعد احتجاج میں شریک کچھ سیاسی کارکنان کو ڈی۔ پی۔ او کی رپورٹ پر ۳ ایم۔ پی۔ او کے تحت گرفتار کیا گیا۔ ڈپٹی کمشنر کے یہ آرڈرز پشاور ہائی کورٹ میں چیلنج کر دیئے گئے۔ ڈپٹی ایڈووکیٹ جنرل نے موقف اختیار کیا کہ:

- چونکہ حکومت نے آرٹیکل ۲۴۵ کے تحت فوج تعینات کی ہے اس لئے ہائی کورٹ دفعہ ۱۹۹ کے تحت نظر ثانی کا اختیار استعمال نہیں کر سکتی۔ یعنی درخواست گزاروں کا معاملہ ناقابل سماعت ہے۔
- ڈپٹی کمشنر کے آرڈرز قانون کے بالکل مطابق ہے کیوں کہ مدعیان غیر قانونی اور پاکستان کے مفاد کے خلاف اقدامات میں ملوث ہیں۔

اس صورت میں عدالت کو ۳ ایم۔ پی۔ او سے پہلے اپنی اختیار سماعت کے حوالے سے سوال کا جواب دینا تھا ظاہر ہے ایسا ہی ہوتا ہے۔

عدالت پہلے اس شق کی تاریخ کو دیکھتی ہے جس کے مطابق ۱۹۷۷ء سے پہلے اس شق میں [اوسٹر کلاز] نہیں تھا۔ یہ کلاز بھٹو صاحب کے دور میں حکومت شامل کی گیا۔ اس کے بعد عدالت عدالتی نظائر میں سے اس [اوسٹر کلاز] کی تشریح ڈھونڈنا شروع کر دیتی ہے۔ واضح رہے [اوسٹر کلاز] سے مراد [۲۴۵] [۳] ہے جو آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت

⁶⁹ Ouster Clause: a clause or provision included in a piece of legislation by a legislative body to exclude judicial review of acts and decisions of the executive by stripping the courts of their supervisory judicial function.

ہائی کورٹ کے اختیار سماعت ختم کرتا ہے۔ اب ظاہر ہے اگر ہائی کورٹ کے پاس یہ اختیار موجود نہ ہو تو معاملہ یہی پر ختم ہو جاتا ہے۔ پھر آگے ایم۔ پی۔ او تک پہنچ نہیں پائیں گے۔ خیر، آگے بڑھتے ہے۔ عدالت نے کئی عدالتی نظائر دیکھتے ہوئے مندرجہ ذیل اصول وضع کیے۔

(1) عدلیہ کی آزادی آئین کی بنیادی ساخت کا حصہ ہے۔ اس حیثیت میں آئین کی تشریح عدلیہ کا ہی اختیار ہے۔

(2) آئین کے آرٹیکل ۲۱۲ اور ۲۲۵ بالترتیب سول سروسز اور ایکشن معاملات میں دستوری عدالتوں کا اختیار سماعت ختم کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان معاملات کو دیکھنے کے لیے آئین میں متبادل فورم دیئے گئے ہیں۔ لیکن آئین کا آرٹیکل ۲۳۵؛ ۳؛ واحد ایک ایسا آرٹیکل ہے جو بغیر متبادل راستہ مہیا کئے ہائی کورٹ کا اختیار سماعت روکتا ہے۔

(3) "اس اتھارٹی کا حکم کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جائے گا" کا مطلب محض یہ ہے کہ اتھارٹی کا اسی قانون کے تحت قیام ہو گا، جو اس کے تحت کام کرتے ہیں اسی اتھارٹی کے دائرہ اختیار سماعت میں آئیں گے، صرف اس قانون میں دیئے گئے وجوہات کو بنیاد بنا کر ان کے خلاف ایکشن لیا جا سکے گا۔ یہی کچھ {اوسٹر کلاز} کے اختیار میں آتا ہے۔ تاہم بدینتی یا قانون سے تجاوز کر کے کارروائی کو آئینی عدالتی آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت دیکھ سکتے ہیں۔

(4) یہ شق، بغیر اختیار [کورم نان جوڈس⁷⁰] اور بدینتی پر مبنی اقدامات کو دستوری عدالتوں کے اختیار نظر ثانی سے نہیں بچاتی۔

(5) کسی معاملہ پر عدالت کو اختیار سماعت ہے یا نہیں کا فیصلہ عدالتیں خود کرتی ہیں۔

(6) آرٹیکل ۲۳۵ [۳] میں [سبجیکٹ ٹو لاء] کا مطلب یہ ہے کہ افواج پاکستان سول انتظامیہ کی مدد کرتے ہوئے کوئی ایسا اقدام نہیں کر سکتی جو قانون سے تجاوز کے مترادف کہلائے۔

(7) اس شق میں الفاظ سول پاور کا مطلب ہے کہ اس صورت میں سول پاور تو وہی رہتا ہے۔ یعنی افواج سول پاور (عدلیہ جس کا لازمی حصہ ہے) کو معطل نہیں کر سکتی۔

⁷⁰ Coram Non Judge: It is a legal term typically used to indicate a legal proceeding that is outside the presence of a judge (or in the presence of a person who is not a judge), with improper venue, or without jurisdiction.

ان اصولوں سے واضح ہوتا ہے کہ ان معاملات میں ہائی کورٹ کے پاس اختیار سماعت ہے۔ اسی لیے عدالت نے ایڈووکیٹ جنرل کے اعتراضات کو مسترد کرتے ہوئے درخواستوں کو قابل سماعت قرار دیا۔ اب ہم دیکھیں گے کہ عدالت نے ۳ ایم۔ پی۔ او کا معاملہ کیسے دیکھا اور نمٹایا۔ واضح رہے عدالت کے سامنے سوال ڈپٹی کمشنر کا ۳ ایم۔ پی۔ او کو استعمال کرنے کی اہلیت کا نہیں بلکہ جاری شدہ آرڈرز کی صحت کا تھا۔ ۳ ایم۔ پی۔ او کے آرڈرز سے متعلق حکومت کا موقف تھا کہ چون کہ مدعیان نے غیر قانونی سرگرمیوں اور امن خراب کرنے میں ملوث ہیں اس لیے یہ آرڈرز مناسب ہیں۔

عدالت کا فیصلہ:

- (1) ہر شہری کو آزادی آئین پاکستان کی آرٹیکل ۹ دیتا ہے۔ اور آرٹیکل ۴ کے مطابق سلوک ہر کسی کا ناقابل انتقال حق ہے۔
 - (2) کسی کو جرم کے ارتکاب سے پہلے صرف معقول وجوہات کے دستیاب ہونے پر ہی گرفتار کیا جاسکتا ہے۔
 - (3) ان وجوہات پر اپنی سوچ سمجھ کا استعمال کرنا ضروری ہے۔ اس کا استعمال کیے بغیر کوئی بھی حکم قانون کے مطابق نہیں کہلا جاسکتا۔
 - (4) ضروری ہے کہ سوچ سمجھ کرنے کے بعد گرفتاری کا حکم دینے والی اتھارٹی کے ذہن میں کوئی ابہام نہ رہے۔ یوں پوری تسلی کے بعد اس قسم کا آرڈر کیا جاسکتا ہے۔
 - (5) اعلیٰ عدلیہ گرفتاری کے حکم کی معقولیت کو دیکھ سکتی ہے۔ کوئی حکم دستیاب وجوہات کے مطابق ہے یا نہیں کہ فیصلہ اصول معقولیت پر ہوگا۔
- ڈپٹی کمشنر کے سامنے مسوائے ایک ایف آئی آر کے کوئی وجہ نہ ہونے کی وجہ سے عدالت نے گرفتاری کے حکم کو غیر معقول قرار دیتے ہوئے کالعدم کر دیئے۔

خلاصہ:

عدلیہ کی آزادی آئین کی بنیادی ساخت اور نمایاں خصوصیات میں سے ایک ہے۔ اختیار سماعت پر قدغن چاہے آئین لگائے یا ماتحت قانون پھر بھی ہائی کورٹ یہ دیکھنے کے لیے کہ آیا متعلقہ اتھارٹی، آفیسر کے اقدام میں اختیار سے تجاوز اور بدینیگی کا عنصر تو نہیں ہے عدالتی نظر ثانی کا دائرہ اختیار استعمال کر سکتی ہے۔ یہ عنصر عدالت کو اپنا دائرہ اختیار نظر ثانی استعمال کرنے کا جواز فراہم کرتی ہے۔

محکمہ انضباطی/تادیبی کارروائی کے تحت پولیس اہلکاروں کی ملازمت سے برطرفی کے حوالے سے سپریم

کورٹ کا انتہائی اہم فیصلہ⁷¹

اویس خان⁷²

حقائق:

عبدالخالق نامی مستغیث پشاور سے لاہور براستہ موٹروے جا رہا تھا کہ ڈسٹرکٹ چکوال نیلا پولیس اسٹیشن کے حدود کے قریب ایک پرائیویٹ گاڑی جس میں ملزمان منظر عباس [اے۔ ایس۔ آئی] اور ڈرائیور کانشیل فرحان نظر سوار تھے، انہوں نے منشیات کے اسمگلروں کی گرفتاری کے تعاقب میں مستغیث کو روک کر اس کی تلاشی لے لی اور فرحان نظر نے اس کی گاڑی کی سوچ بورڈ سے دو لاکھ روپے قبضہ خود کئے۔ مستغیث نے واقعے کی اطلاع موٹروے پولیس کو دی، پولیس نے ملزمان سے دو لاکھ روپے برآمد کر کے حوالہ مستغیث کی اور ان کے خلاف مجموعہ تعزیرات پاکستان کے دفعہ ۳۸۲، ۳۴۱ اور پولیس رولز ۲۰۰۲ کے دفعہ ۱۵۵ اور ۱۵۶ کی تحت مقدمہ درج کر لیا۔ ٹرائل کورٹ نے ملزمان کو ۲۳۹۔ اے کے تحت بری کر دیا لیکن محکمہ تادیبی کارروائی کے دوران ان کو بلا اجازت پرائیویٹ گاڑی میں سفر، اختیارات کا ناجائز استعمال، جبراً پیسے بٹورنے، مس کنڈکٹ⁷³ اور انخائے حقائق سے کام لینے کی پاداش میں معطلی اور بالآخر پنجاب پولیس رولز، ۱۹۷۵ کے رول ای اور ڈی کے تحت ملازمت سے برخاستگی کی سزا کا سامنا کرنا پڑا۔ تادیبی کارروائی کے خلاف پنجاب سروس ٹرابول میں اپیل دائر کی گئی، لیکن اس نے بھی سزا برقرار رکھی۔ فیصلے کے خلاف ملزمان نے سپریم کورٹ سے آئین آرٹیکل ۲۱۲ [۳] کی تحت رجوع کر لیا۔ عدالت کے سامنے سوال تھا کہ کیا مجرمانہ بریت تادیبی کارروائی کو متاثر کرتی ہے یا نہیں؟

ملزمان کے وکیل نے عدالت کے سامنے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ چونکہ ملزمان کو زیر دفعہ ۲۳۹۔ اے مجموعہ ضابطہ فوجداری کے تحت رہائی ملی ہے لہذا ان کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہیں ہو سکتی جو اب میں عدالت نے اپنا موقف اپنے ہی ایک فیصلے⁷⁴ پر منحصر کر کے واضح کیا کہ فوجداری کیس میں رہائی تادیبی کارروائی کو نہیں روک

71 اس فیصلے کو ۲۰۲۰ کی سول پٹیشن نمبر ۳۰۳۱۰۵ اور ۳۱۰۵ کے طور پر تلاش کیا جاسکتا ہے۔

72 شریعہ اینڈ لاء، ممبر ٹیم آئین و قانون ویگ لائر فورم بہت نیلا، مالکنڈ

73 Misconduct

74 ۲۰۱۱ء، ایس، سی، ایم، آر ۵۳۴

سکتی اور یہ دونوں کارروائیاں ایک ہی وقت میں ایک ساتھ چل سکتی ہے اور مجرمانہ بریت تادیبی کارروائی کو متاثر نہیں کر سکتی تاہم فوجداری مقدمات میں رہائی بعض اوقات تادیبی کارروائی کرتے ہوئے زیر غور لایا جاسکتا ہے۔ کیس کے تمام پہلوؤں کو دیکھنے کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ ملزمان نے اختیارات کا ناجائز استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ پولیس کی وردی میں افسران بالا کی اجازت کے بغیر دوسرے شہر سفر کر کے جرم کار کتاب کیا ہے

پولیس والوں کا ایسے واقعات میں ملوث ہونا نہ صرف ڈیوٹی میں خیانت ہے بلکہ پولیس فورسز کے کردار پر بد نما داغ لگانے کا سبب بنتا ہے لہذا قانون کی حکمرانی، مستقبل میں ایسے جرائم کی روک تھام اور اصول احتساب کو مد نظر رکھتے ہوئے تادیبی کارروائی برقرار رکھنا نہایت ضروری ہے۔

ایک ہی وقت سے متعلق ایک سے زائد ایف آئی آر درج کروانے کے معاملے پر سپریم کورٹ کا اہم فیصلہ⁷⁵

افراسیاب خان⁷⁶

اس کیس میں بنیادی سوال یہ زیر غور تھا کہ کیا کسی کیس میں ایک ایف آئی آر درج ہونے کے بعد مزید معلومات فراہم کر کے دوسری و تیسری ایف آئی آر درج کروا سکتے ہیں یا نہیں؟

حقائق:

صغراں بی بی نامی خاتون پاکستان کی اعلیٰ عدلیہ میں آئین پاکستان کے آرٹیکل ۱۸۴ [۳] کے تحت ایک انسانی حقوق کیس فائل کرتی ہے۔ جس میں صغراں بی بی اعلیٰ عدلیہ سے مطالبہ کرتی ہے کہ عدالت مقامی پولیس کو دوسری ایف آئی آر درج کرنے کا حکم دے تاکہ وہ اپنے بیٹے (جس کا نام محسن علی تھا) کے قتل میں ملوث پولیس اہل کاروں پر دوسری ایف آئی آر درج کر سکے، جو کہ ۲۰۰۸ میں پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا۔ یاد رہے کہ مقتول جس دن اپنی زندگی سے محروم ہوا تھا، اسی دن پولیس اپنی طرف سے پہلی ایف آئی آر درج کر چکی تھی۔ پولیس کی جانب سے درج کیے جانے والی ایف آئی آر میں مقتول محسن علی پر یہ الزام عائد تھا کہ چونکہ محسن علی کی جانب سے پولیس پر قاتلانہ حملہ کیا گیا تھا اس وجہ سے پولیس نے اپنی ذاتی دفاع کے حق کو استعمال کرتے ہوئے جوابی فائرنگ کی،

75 پی ایل ڈی ۲۰۱۸ سپریم کورٹ ۵۹۵

76 طالب علم شریعہ و قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

جس کے نتیجے میں محسن علی جاں بحق ہو گیا۔ اس کیس سے متعلق تفتیش مکمل ہونے کے بعد چالان سیشن کورٹ لاہور میں پیش کیا گیا تاکہ کیس میں ملوث ملزمان کے خلاف مقدمہ چلایا جاسکے

جنوری ۲۰۱۰ میں موجودہ درخواست گزار یعنی صفراں بی بی اسی واقعے کے حوالے سے ایک پرائیویٹ شکایت درج کرتی ہے جس میں وہ پولیس پر الزام عائد کرتی ہے کہ اسکے بیٹے کو مقامی پولیس نے جعلی مقابلے کا انتظام کر کے بے رحمی سے قتل کیا ہے، نہ کہ ذاتی دفاع کے حق میں۔ یعنی پولیس کی جانب سے درج کیے جانے والی ایف آئی آر میں جو واقعے کی تفصیل بیان کی گئی ہے وہ حقیقت پر مبنی نہیں۔ صفراں بی بی کی طرف سے دائر پرائیویٹ درخواست کے متعلق مئی ۲۰۱۰ میں ایڈیشنل سیشن جج کی جانب سے ۱۶ پولیس اہل کاروں کو باہمی النظر ثبوت کے بنیاد پر عدالت میں ٹرائل کے لئے طلب بھی کیا گیا اور ۲۰۱۶ میں طلب کیے گئے ملزمان کے خلاف چارج فریم کیا گیا۔ یہ ٹرائل ابھی اختتام کو نہیں پہنچا تھا کہ صفراں بی بی پولیس اہل کاروں کے خلاف اس واقعے کے متعلق الگ ایف آر کرانا چاہتی تھی۔ لیکن پولیس کی جانب سے الگ ایف آئی آر درج نہ کرنے پر صفراں بی بی اعلیٰ عدلیہ کے انسانی حقوق سیل میں درخواست دائر کرتی ہے جس میں مطالبہ کیا جاتا ہے کہ عدالت مقامی پولیس کو اس کے بیٹے کے قتل میں ملوث اہل کاروں کے خلاف الگ ایف آئی آر درج کرنے کی ڈاریکشن دیں۔ تاکہ صفراں بی بی ایف آئی آر میں اس واقعے کے متعلق اصل تفصیل بیان کر سکے۔ یہ بات یہاں واضح رہے کہ درخواست گزار کا الگ ایف آئی آر درج کروانے کے اصرار کے پیچھے اپنے بیٹے کے قتل میں ملوث پولیس اہل کاروں کو سلاخوں کے پیچھے دیکھنے کی خواہش تھی۔

اس کیس کے متعلق، سپریم کورٹ کے سامنے مختلف مواد اور متعدد ایف آئی آرز کے اندراج پر اعلیٰ عدالتوں کے متضاد فیصلے موجود تھے، تاہم، صراحتاً قانونی دفعات خاموش تھیں۔ اس لیے اس وقت کے چیف جسٹس، جناب آصف سعید کھوسہ صاحب کی سربراہی میں سات ججز پر مشتمل ایک لار جرنلنگ تشکیل دی گئی۔ جس میں انارنی جرنل آف پاکستان، دارالحکومت اور صوبوں کے ایڈووکیٹ جنرلز نے اعلیٰ عدلیہ کی معاونت کی اور ساتھ میں معروف قانون دان بیرسٹر سلمان صفدر کو عدالتی معاون مقرر کیا گیا۔ یہ بات واضح رہے کہ جب بھی کوئی ایسا معاملہ عدالت کے سامنے آئے جس پر قانونی دفعات خاموش ہو اور اعلیٰ عدالتوں کی جانب سے فیصلوں میں بھی تضاد ہو تو چیف جسٹس آف پاکستان ایک بڑا بیج تشکیل دیتے ہیں تاکہ ایک طے شدہ اصول بنایا جائے، اور زیر مطالعہ کیس میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔

سب سے پہلے عدالت کی جانب سے اس کیس کو تمام اعلیٰ عدالتوں کے فیصلہ جات کے تناظر میں دیکھا گیا، جس میں کچھ فیصلے الگ ایف آئی آر کے حق میں تھے اور کچھ مخالف۔ ساتھ ہی مجموعہ ضابطہ فوجداری اور پولیس رولز ۱۹۳۲ کی اسکیم کا جائزہ بھی لیا گیا اور خصوصی طور پر عوام الناس میں رائج ایف آئی آر اور گرفتاری کے متعلق غلط تصور کو ختم کیا گیا۔

فیصلے میں عدالت کی جانب جو قانونی نکات پیش کیے گئے، وہ درج ذیل ہیں:

1. ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۱۵۴ کے مطابق مقامی پولیس کو قابل سزا جرم کے بارے میں فراہم ہونے والی پہلی معلومات ایف آئی آر کہلاتی ہے۔ یعنی کہ کسی بھی ذریعے سے موصول ہونے والی اطلاع کہ فلاں اور فلاں گاؤں میں قتل ہوا ہے، اگر اتنی معلومات واضح ہے تو یہ معلومات کسی بھی ایف آئی آر درج کرنے کے لیے کافی سمجھی جائیں گی۔
2. اگر مقامی پولیس کو قابل دست اندازی جرم کے بارے میں موصول ہونے والی معلومات میں ایک ورژن ایسے ملے کہ جرم کار تکاب کیسے ہوا، کس کے ذریعے اور کس پس منظر میں کیا گیا، تو ایسی معلومات کو پولیس نوٹ تو کر سکتی ہے مگر بغیر تفتیش کے اسے حق اور سچ تسلیم نہیں کرے گی۔ یعنی مجرم کی طرف سے فراہم کردہ معلومات کی پولیس پہلے تفتیش کرے گی، اگر ثبوتوں سے واقعہ ثابت ہو جائے تو تب ہی اسے اہمیت دی جائے گی۔
3. ایف آئی آر کے اندراج کے بعد، جب فوجداری مقدمہ شروع ہوتا ہے، تو اس وقت کسی بھی کیس کو جو نمبر تفویض کیا جاتا ہے، وہ کیس کے حتمی فیصلے تک وہی نمبر رہے گا۔
4. ایف آئی آر کے اندراج کے بعد تفتیشی افسر کے پاس اختیارات ہیں کہ وہ ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۱۶۱ کے مطابق ایک ہی واقعے کے حوالے سے مختلف افراد کی جانب سے دیے گئے ورژن کو ریکارڈ کر سکتا ہے۔ لیکن ایک ہی واقعے کے کسی نئے ورژن کے لیے کوئی الگ ایف آئی آر درج نہیں کر سکتا۔
5. تفتیش کے دوران تفتیشی افسر پر لازم ہے کہ وہ تمام پہلوؤں سے معاملے کی چھان بین کرے گا جیسا کہ پولیس رولز میں موجود ہے کیونکہ تفتیشی افسر کا فرض ہے کہ واقعہ سے متعلق اصل حقائق کو تلاش کرے اور ان لوگوں کو بھی تلاش کرے جو اس کے ذمہ دار ہیں۔ یعنی کہ پولیس معاملے کی

چھان بین کے لیے کسی بھی جلد بازی میں کسی کو مجرم یا بے قصور نہیں ٹھہرائی گی بلکہ وہ منصفانہ اور کھلے ذہن سے حقیقت کا پتہ لگائے گی۔

6. کسی بھی شخص کو فوری طور پر صرف اس وجہ سے گرفتار نہیں کیا جائے گا کہ اسے ایف آئی آر میں ملزم نامزد کیا گیا ہے اور نا ہی فقط کسی دوسرے شخص کی طرف سے تفتیشی افسر کو فراہم کردہ معلومات کی بنیاد پر گرفتاری کی جائے گی۔ بلکہ تفتیشی افسر پر لازم ہے کہ کسی شخص کی گرفتاری کے لئے اس کے پاس مکمل جواز موجود ہو۔ گرفتاری اور اس کے متعلق جواز کے لیے رہنمائی ضابطہ فوجداری اور پولیس رولز کی متعلقہ دفعات سے لی جاسکتی ہے۔ کیونکہ ذکر شدہ قوانین بغیر معقول وجوہات کے کسی کو گرفتار کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

7. تفتیش کے اختتام دفعہ ۱۷۱ء کے تحت جو رپورٹ پیش کی جائیگی، وہ اصل حقائق پر مبنی ہوگی۔ یعنی تفتیش کے دوران کسی افراد سے ملنے والی معلومات اصل حقائق پر حاوی نہیں ہونی چاہیے، بلکہ جو اختتامی رپورٹ ہو وہ مکمل غیر جانبداری اور حقائق پر مبنی ہو۔

خلاصہ: عدالت نے ایک ہی واقعے کے متعلق الگ ایف آئی آرز کو ناجائز قرار دیا اور ساتھ میں گرفتاری اور فوجداری مقدمہ میں ایف آئی آر کے اندراج کے درمیان ایک واضح تفریق بیان کر دی۔ کیس کے متعلق صفراں بی بی کی درخواست خارج کر دی گئی اور ٹرائل کورٹ کو ہدایت کی گئی کہ وہ درخواست گزار کی پرائیویٹ شکایت کا چارہا کے اندر فیصلہ کرے۔

توہین رسالت کے حوالے سے سیشن کورٹ کا فیصلہ⁷⁷

سجاد حمید یوسفزئی⁷⁸

حقائق:

یہ کیس مستغیث حسناٹ فاروق کے ایف آئی آر کے تحت درخواست دائری سے شروع ہوا۔ درخواست کے بعد ایف آئی آر کے لئے انکوائری کی جس میں یہ بات ثابت ہوئی کہ درخواست میں دم ہے

77 فیصلے کی تاریخ ۱۹ جنوری ۲۰۲۳ء، سیشن کیس نمبر ۱۱۳ آف ۲۰۲۰

78 ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

اور ملزمہ نے واقعی توہین کا جرم کیا ہے۔ اس کے بعد ایف۔ آئی۔ اے نے ایف آئی آر درج کی جس میں دفعہ ۲۹۵-اے، ۲۹۵-سی، ۲۹۸-اے اور ۱۰۹ مجموعہ تعزیرات پاکستان شامل کیے گئے۔ الزام یہ تھا کہ ملزمہ نے واٹس ایپ اسٹیٹس پہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق نازیبا خاکے شئیر کیے تھے اور حضرت ام عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے متعلق نازیبا الفاظ کا استعمال کیا تھا۔ یہ بھی بیان ہوا کہ ملزمہ نے مستغیث کو واٹس ایپ پہ بھی توہین آمیز جملے بھیجے ہیں۔ اسی طرح توہین آمیز مواد لیے کچھ لنکس بھی سٹڈ کیے گئے۔ مستغیث نے اس بابت اسکرین شارٹس اور دیگر مواد بطور ثبوت مہیا کیے۔ ایف۔ آئی۔ اے نے بعد ازاں ملزمہ کے گھر پہ چھاپہ مارا وہاں سے لیپ ٹاپ اور موبائل فون قبضے میں لیا ان کا فورنرک کروایا اور پوری طرح تحقیق کے بعد ایجنسی اس نتیجہ پہ پہنچی کہ ملزمہ توہین رسالت و توہین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی مرتکب ہوئی ہے۔ یہ تمام ثبوت عدالت کے سامنے رکھے گئے۔ تمام گواہان کی گواہی ریکارڈ ہوئی ان پہ جرح بھی ہوئی اور بالآخر عدالت اس نتیجہ پہ پہنچی کہ ملزمہ مذکورہ بالا دفعات کے تحت مجرم ثابت ہو چکی ہے۔

ملزمہ کے وکیل کے دلائل :

فاضل وکیل نے عدالت کے سامنے کہا کہ یہ کیس بدینی پر مبنی ہے اور اس کا اصل محرک مستغیث بذات خود ہے کیونکہ یہ مستغیث ہی تھا جس نے ملزمہ کو توہین رسالت کی ارتکاب پہ ابھارا۔ یہ بھی کہا گیا کہ ملزمہ اور مستغیث اپنے دود گرو دستوں کے ساتھ مل کر پیب جی گیم کھیلا کرتے تھے۔ اس طرح سے دونوں کا رابطہ استوار ہوا نمبر کا تبادلہ ہوا۔ بعد ازاں مستغیث نے تعلق کی استواری کے لیے ملازمہ پہ زور ڈالا۔ اور انکار کرنے پہ مستغیث نے یہ کیس گھڑ لیا۔

استغاثہ کے دلائل :

استغاثہ نے کہا کہ ہم اپنا کیس کسی شک شبہ سے بالا تر ثابت کر چکے ہیں۔ تمام تر ثبوت اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں کسی ثبوت کو توڑا نہیں گیا۔ ملزمہ نے واٹس ایپ اسٹیٹس، سوشل میڈیا، اکاؤنٹس اور گفتگو میں توہین پر مبنی مواد شئیر کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق توہین آمیز خاکہ بھی شئیر کیا ہے۔ اور یہ تمام تر باتیں ثبوتوں سے واضح ہیں۔

عدالت کا فیصلہ :

عدالت نے تمام تر ثبوتوں کا جائزہ لیا۔ تمام گواہان کی گواہی ریکارڈ کی۔ ان پہ جرح کو بھی مد نظر رکھا اور اس نتیجے پہ پہنچی کہ استغاثہ اپنا کیس شک شبہ سے بالاتر ثابت کرنے میں مکمل کامیاب ہوئی ہے اور ملزمہ مذکورہ دفعات کے تحت اب مجرم ثابت ہو چکی ہے۔

اس موقع پہ عدالت کے سامنے ملزمہ نے اپنا بیان یوں ریکارڈ کروایا: "میں ایک مسلمان خاندان میں پیدا ہوئی اور میری شادی ایک مسلمان خاندان میں ہی ہوئی۔ میں اب بھی خدا کی توحید اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے پر ایمان رکھتی ہوں۔ بطور مسلمان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ایک بھی نازیبا لفظ کہنے کی جرات نہیں کر سکتی سوائے اس کے جو زندگی کے کسی موڑ پہ بلا ارادہ کسی کے ابھارنے پہ مجھ سے سرزد ہوئے ہوں۔

لہذا میں اپنے رب اللہ سے معافی کہ خواست گار ہوں ان گناہوں کے بابت جو میں نے جان کر یا بھول کر کیے یا علانیہ کیے یا غیر علانیہ کیے۔ میں ان گناہوں کی بھی معافی چاہتی ہوں جن سے میں باخبر ہوں یا جن سے میں باخبر نہیں ہوں۔ خدا سے بڑھ کر کوئی طاقت نہیں۔ وہی سب سے بڑی طاقت ہے۔"

اس بیان کے بعد ملزمہ کے وکیل نے کہا کہ شرعی طور پر اگر کوئی مسلمان اپنے کیے کی معافی مانگے تو اس کی معافی قبول ہونی چاہیے۔ لہذا ملزمہ کی معافی قبول فرما کر اسے بری کیا جائے۔ اس پہ معزز عدالت نے وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے⁷⁹ اور دوسرے فیصلے⁸⁰ پہ انحصار کرتے ہوئے کہا کہ ایسی معافی قابل قبول نہیں ہے۔

عدالت نے معافی کو قبول نہ کرنے کی ۳ وجوہات ذکر کی۔

1. یہ کہ ملزمہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی ہے اور اس میں تکرار ہے،
2. یہ کہ ملزمہ نے آگے بڑھ کر ام المومنین کی شان میں بھی گستاخی کی ہے
3. یہ کہ ملزمہ نے مستغنیث کے ساتھ واٹس ایپ چیٹ میں خود کو سابقہ مسلمان ظاہر کیا ہے جس سے اس کا ارتداد واضح ہے اور مرتد واجب القتل ہوتا ہے۔

سزا دیتے ہوئے معزز عدالت نے فرمایا کہ ملزمہ کسی رعایت کی مستحق نہ ہے کیونکہ اس نے صرف ایک بار نہیں کئی بار اور ایک شخصیت کی نہیں بلکہ دو مذہبی مقدس شخصیات کی توہین کی ہے۔ جرم میں تکرار ہے۔

79 پی ایل ڈی ۲۰۱۴، وفاقی شرعی عدالت ۹۸

80 ۲۰۰۶ء، ایل، آر ۹۸۵

لہذا ۲۰۱۵ء - سی کے مطابق سزائے موت سنائی گئی اور دیگر دفعات کے تحت مختلف دورانہ کی قید اور جرمانے سنائے گئے۔

سپریم کورٹ کا پہلی درخواست ضمانت کے خارج ہونے کے باوجود ٹرائل کی تکمیل میں ایک سالہ تاخیر کو دوسری درخواست ضمانت کے لیے دوبارہ نئی بنیاد تصور کرنے کے حوالے سے اہم فیصلہ⁸¹

حزہ خان⁸²

حقائق: لاہور ہائی کورٹ نے اپنے حکم صدرہ مورخہ ۱۷ اپریل ۲۰۲۳ کے ذریعے مدعا علیہ کی درخواست ضمانت بعباد گرفتاری ساعت میں تاخیر کی بنیاد پر منظور کی، جس کی منسوخی کے لئے درخواست گزار/مستغین نے سپریم کورٹ میں درخواست دائر کی۔ اسی درخواست پہ ذیل فیصلہ آیا۔

اس سے قبل لاہور ہائی کورٹ نے مورخہ ۱۱ جنوری ۲۰۲۱ حکم و فیصلہ صادر کر کے مدعی الیہ کی درخواست ضمانت میرٹ اور ساعت کی تکمیل میں تاخیر کی بنیاد پر خارج کی تھی۔ اور ساتھ ہی ٹرائل کورٹ کو یہ ہدایت بھی جاری کی تھی کہ وہ مدعی الیہ کا ٹرائل ۳۰ دن کے اندر اندر مکمل کریں۔

جب مدعی الیہ کا ٹرائل ۵۱ ستمبر ۲۰۲۲ تک یعنی پورے ایک سال میں مکمل نہیں ہو سکا تو اس نے تاخیر کو بنیاد بنا کر دوسری درخواست ضمانت دائر عدالت کی، تاہم ٹرائل کورٹ نے دوسری درخواست ضمانت خارج کرتے ہوئے یہ قرار دیا کہ مدعی نے پہلے بھی اسی بنیاد پر درخواست ضمانت دائر کی تھی جسے ہائی کورٹ و سپریم کورٹ دونوں نے خارج کیا تھا۔ پس مقدمہ کی تکمیل میں تاخیر کی بنیاد پر دوسری درخواست ضمانت قابل ساعت نہ ہے۔

مدعی الیہ نے ماتحت عدالت کے اس حکم و فیصلہ کو لاہور ہائی کورٹ میں چیلنج کیا اور ہائی کورٹ نے ۱۷ اپریل ۲۰۲۳ کو حکم و فیصلہ سنا کر درخواست ضمانت منظور کی۔ ماتحت عدالت کی رپورٹ کے مطابق ٹرائل کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ جیل میں موجود ویڈیولنک سسٹم میں خرابی تھی جس کے ذریعے مدعی الیہ حاضر عدالت ہوتا تھا۔ اسی طرح کئی بیٹھیوں پر مدعی الیہ اس لئے حاضر عدالت نہ ہو سکا کیونکہ وہ شدید بیمار ہو کر ہسپتال میں داخل

81 اس کیس کے جج جسٹس منصور علی شاہ اور جسٹس عائشہ ملک ہے اور اسے فوجداری درخواست نمبر ۵۸۸-۱۱-۲۰۲۳ پر تلاش کیا جاسکتا ہے۔

82 ایڈووکیٹ ڈسٹرکٹ کورٹس، تیمر گڑھ، دیر لویئر۔

کروایا گیا تھا۔ چند اور پیشیوں پر استغاثہ کے گواہان کی غیر حاضری تاخیر کا سبب بنی۔ پس اس ایک سال میں کم از کم مدعی الیہ کارویہ تاخیر کا سبب نہیں بنا۔

عدالت کے سامنے سوال:

عدالت کے سامنے سب سے اہم قانونی سوال یہ تھا کہ ملزم کی پہلی درخواست ضمانت کے خارج ہونے کے بعد اگر پورے ایک سال میں بھی ٹرائل مکمل نہیں ہوتا، جبکہ ملزم خود تاخیر کا باعث نہ ہو، تو ایسی صورت میں ٹرائل کی تکمیل میں تاخیر کو درخواست ضمانت کے لئے "نئی بنیاد" تصور کیا جاسکتا ہے کہ نہیں؟ سپریم کورٹ نے اس سوال پر بحث کرنے سے پہلے متعلقہ قانون کی طرف رجوع کیا۔ ضابطہ فوجداری کے دفعہ ۲۹۷(۱) کے تیسرے فقرے شرطیہ کے مطابق اگر کسی شخص پر ایسے جرم کا الزام ہو جس کی سزا موت نہ ہو اور اس نے اسی جرم کی وجہ سے جیل میں اسال سے زائد عرصہ گزارا ہو اور وہ کسی طور بھی خود ٹرائل میں تاخیر کا باعث نہ ہو، تو ایسے شخص کو عدالت لازمی طور پر ضمانت پر رہا کرے گی۔ موجودہ کیس کے ایف آئی آر میں ایسی کوئی دفعہ شامل نہیں ہے جس کی سزا موت ہو۔

فاضل وکیل مدعی نے مؤقف اپنایا کہ ایک دفعہ جب کسی ملزم کے ٹرائل میں تاخیر کی بنیاد پر دائر کردہ درخواست ضمانت خارج ہو جائے اور ملزم کو ہی ٹرائل میں تاخیر کا باعث قرار دیا جائے، تو ایسے شخص کی "نئی" درخواست ضمانت مذکورہ بنیادوں پر قابل سماعت نہیں ہو سکتی، خواہ نئی درخواست ضمانت کسی دوسرے وقت کے دوران کے لئے کیوں نہ ہو۔

عدالت نے اس دلیل کو پذیرائی نہیں دی کیونکہ اولاً ملزم کا ٹرائل میں تاخیر کی بنیاد پر حق ضمانت وقت پر منحصر ہوتا ہے۔ ثانیاً اگر ٹرائل میں تاخیر سال سے بڑھتی ہے، جبکہ ملزم کا اس تاخیر میں کوئی ہاتھ نہ ہو، اور ملزم پر ایسے کسی جرم کا الزام نہ ہو جس کی سزا موت ہو، تو ایسی صورت میں ملزم کا حق ضمانت از سر نو وجود میں آتا ہے۔ یہ حق ملزم کی گرفتاری کے دن سے شروع ہو کر ہر سال کے لئے الگ سے پیدا ہوتا ہے بشرطیکہ اس ایک سال میں تاخیر کا باعث خود ملزم نہ ہو اور مقدمہ دفعہ ۲۹۷(۱) کے چھوٹے فقرے شرطیہ میں نہ آتا ہو۔

اسی طرح ملزم کی پہلی درخواست ضمانت کے خارج ہونے کے بعد سال سے زیادہ تاخیر کے بنیاد پر بار بار پیدا ہونے والا حق ضمانت منظور نہ کرنا، جبکہ ملزم خود تاخیر کا باعث نہ ہو، استغاثہ کو لائنسنس دینے کے مترادف ہوگا کہ وہ غیر معینہ مدت کے لئے انڈر ٹرائل ملزم کو سلاخوں کے پیچھے رکھوا سکے۔ یہ آئین کے آرٹیکل ۱۰۹-۱۰۱ اور ۱۴ میں موجود بنیادی انسانی حقوق کا مذاق اڑانے کے مانند ہوگا۔

مزید برآں، تشریح کا اصول یہ ہے کہ اگر کسی فوجداری قانون کے کسی شق کے دو تشریحات کی جاسکتی ہو، تو ایسی تشریح کو ترجیح دی جائے گی جو ملزم کے حق میں بہتر ہو، نہ کہ استغاثہ کے حق میں۔ چونکہ قانون میں موجود ٹرائل کی تکمیل میں تاخیر کے بنیاد کا سرچشمہ خود آئین ہی کے آرٹیکل ۱۰، ۹-اے اور ۱۴ ہیں، لہذا مذکورہ تیسرے فقرے شرطیہ کی ایسی تشریح کرنی چاہیے جو زیر ساعت ملزم کے حق کو بڑھاتا ہو کیونکہ قانون ملزم کو اس وقت تک معصوم تصور کرتا ہے جب تک اس کے خلاف کیس ثابت نہ کیا جائے۔

عدالت نے ٹکلیل شاہ کیس کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس کیس میں سپریم کورٹ نے مذکورہ تیسرے فقرے شرطیہ کا مقصد ملزم کے ٹرائل کو تیز تر بنانا اور زیر ساعت ملزم کے حراست کو اس سال تک محدود کرنا قرار دیا ہے، بشرطیکہ جرم کی سزا موت نہ ہو۔ اب اگر ملزم کا ٹرائل پورے ایک سال میں مکمل نہیں ہوتا اور ملزم کا اس تاخیر میں کوئی قصور بھی نہیں ہوتا تو ایسی صورت میں ملزم کا حق ضمانت پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اگر ملزم خود تاخیر کا سبب بنے تو وہ حق ضمانت کھودیتا ہے، تاہم اسی بنیاد پر درخواست خارج ہونے کے بعد اگر وہ اپنے عمل میں درستگی لا کر اسلندہ سال میں تاخیر کا سبب بننے سے اجتناب کریں اور پھر بھی استغاثہ پورے ایک سال میں کیس منطقی انجام کو نہ پہنچا سکے تو ایسی صورت میں ملزم کا "غی" حق ضمانت وجود میں آتا ہے۔

فیصلہ :

سپریم کورٹ نے مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں ہائی کورٹ کے حکم کو برقرار رکھتے ہوئے مدعی کے درخواست کو میرٹ کے خلاف قرار دے کر خارج کیا، اور ٹرائل کورٹ کو ہدایت جاری کی کہ وہ تین ماہ کے اندر اندر ٹرائل کو مکمل کریں۔

خلاصہ :

اگر کسی ملزم کی درخواست ضمانت خارج ہونے کے بعد پورا ایک سال گزر جائے اور استغاثہ ٹرائل مکمل کرنے میں ناکام رہے، تو ملزم کا حق ضمانت ایک بار پھر پیدا ہوتا ہے، بشرطیکہ اس پر الزام ایسے جرم کا نہ ہو جس کی سزا موت ہو اور وہ خود ٹرائل میں تاخیر کا سبب نہ بنے۔

قانوناً بری ہونا" اور "باعزت بری ہونا" کی یکسانیت اور سرکاری ملازم کی ملازمت پہ ان دونوں کا اثر کے

حوالے سے سپریم کورٹ کا فیصلہ⁸³

و قاص علی خان⁸⁴

۲۱ اگست ۱۹۸۹ کو تھانہ کالنگ ضلع مردان میں محمد رحیم کے رپورٹ پر برخلاف ڈاکٹر محمد اسلم اور فضل محمد پر زیر دفعہ ۳۳/۳۰۲ مجموعہ تعزیرات پاکستان، شیر زمین کے قتل کے الزام میں مقدمہ درج کیا جاتا ہے۔

بیانات ریکارڈ ہونے کے بعد ایڈیشنل سیشن جج صاحب ۹ جون ۱۹۹۲ کو فیصلہ جاری کرتا ہے کہ، مستغیث (محمد رحیم) کے بیان کے مطابق وہ ملازم (ڈاکٹر محمد اسلام) پر الزام عائد نہیں کر سکتے۔ مستغیث کے بیان کے بعد ایس۔ پی بھی بیان دیتا ہے کہ وہ ملازم کے خلاف قانونی کارروائی سے دستبردار ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا بیانات کو دیکھتے ہوئے ملازم کے خلاف کوئی مقدمہ باقی نہیں رہتا، اسلئے ملازم کے خلاف کوئی چارج نہیں لگایا اور ان کو موجودہ مقدمے میں لگائے گئے الزام سے بری کر دیا جاتا ہے۔

ملازم چونکہ سرکاری ملازم {ویٹرنری افسر} تھا جس کو مقدمہ ہذا میں ملوث ہونے کے بعد پہلے دن سے معطل کیا گیا تھا اس لئے بری ہونے کے بعد انہوں نے مورخہ ۲۹ جون ۱۹۹۲ کو سروس بحالی کیلئے درخواست دی جو ۷ اپریل ۱۹۹۳ کو متعلقہ اتھارٹی نے منظور کی اور ان کی سروس کو مقدمے والے دن سے بحال تصور کیا گیا، لیکن ان کے معطلی کا دورانیہ کو بغیر کسی تنخواہ کے غیر معمولی چھٹی کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ ملازم نے تنخواہ اور الاؤنس کے لئے سیکرٹری خوراک، زراعت، لائیو سٹاک اینڈ کوآپریٹو ڈیپارٹمنٹ، پشاور کو درخواست دی، جو ۱۹ جون ۱۹۹۳ کو خارج ہوئی، اس کے بعد ملازم نے این۔ ڈبلیو۔ ایف۔ پی سروس ٹریبونل میں اپیل کیا جو ۲۴ اگست ۱۹۹۴ کو اس بنیاد پر خارج کی گئی کہ اپیل کنندہ کی بریت مخالف فریق کے ساتھ راضی نامہ کی بنیاد پر ہے اس لئے اپیل کنندہ کو "باعزت بری" نہیں مانا جاسکتا۔ ٹریبونل نے سپریم کورٹ کے فیصلے⁸⁵ کو بنیاد بنا کر اپیل خارج کی۔ جس میں یہ قرار دیا جا چکا تھا کہ "اپیل کنندہ کی بریت مستغیث کے ساتھ راضی نامہ کی بنیاد پر ہے اسلئے یہ باعزت بری نہیں سمجھا جاسکتا۔ اپیل کنندہ نے این۔ ڈبلیو۔ ایف۔ پی سروس ٹریبونل کے خلاف سپریم کورٹ سے رجوع کیا اور درخواست دائر کی جو کہ ۱۴ مئی ۱۹۹۵ کو منظور ہوئی۔

83 ۱۹۹۸ ایس، سی، ایم، آر ۱۹۹۳

84 ایڈووکیٹ، درگنی بار ایسوسی ایشن، ملاکنڈ

85 پی ایل ڈی، ۱۹۷۶ سپریم کورٹ ۲۰۲

عدالت کے سامنے قانونی سوال:

سپریم کورٹ کے تین رکنی بینچ (جسٹس سعید الزمان صدیقی، جسٹس راجہ افراسیاب خان اور جسٹس وجیہ الدین احمد) کے سامنے سادہ سوال یہ تھا کہ وہ بریت جو راضی نامہ کی بنیاد پر ہو " باعزت " تصور ہوگا یا نہیں؟

فیصلہ:

دلائل سننے اور ریکارڈ جانچنے کے بعد عدالت یہ قرار دیتی ہے کہ مقدمہ ہذا میں ملزم بری ہے۔ اور ملزم اس وقت تک معصوم اور بے گناہ ہیں جب تک ان کے خلاف لگائے گئے الزامات بغیر شکوک و شبہات ثابت نہیں ہو جاتے۔ یہ اصول فوجداری قانون کے طے شدہ اصولوں میں سے ایک ہے کہ سزا کے فیصلے کے لیے یہ استغناہ پر لازم ہے کہ وہ تمام شکوک و شبہات سے بالاتر ہو کر مقدمہ قائم/ثابت کرے، اگر وہ ایسا کرنے میں ناکام ہوتا ہے تو، ملزم بری ہونے کا حقدار ہوگا، اور ایسی بریت باعزت ہوگی، خواہ وہ شک کے فائدہ کا نتیجہ ہو یہ سمجھوتہ کی بنیاد پر ہو۔

دلائل کے دوران دونوں فریقین کے وکلاء صاحبان نے یہ تسلیم کیا کہ ضابطہ فوجداری یا قانون میں کبھی اور جگہ پر " بری " اور " باعزت " میں کوئی امتیاز بیان نہیں کیا گیا ہے، اسلئے اگر ملزم کے خلاف کوئی الزام ثابت نہیں ہوتا اور ٹرائل کورٹ اسے بری کرتا ہے تو وہ بریت " باعزت " بریت ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ تمام بریت " قابل احترام " ہیں اور کوئی بریت نہیں ہو سکتی ہے، جسے توہین آمیز کہا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ ٹرائل کورٹ نے ملزم کو بری کر دیا ہے اسلئے یہ تصور کرنا لازم ہے کہ ملزم پر لگایا گیا الزام بے بنیاد تھا، جس کے نتیجے میں ملزم معصوم بے گناہ تصور کیا جائے گا۔

سپریم کورٹ کے تین رکنی بینچ نے متفقہ طور پر اپیل منظور کرتے ہوئے، اپیل کنندہ کو متخواہ اور الاؤنسز کے بقایا جات کا حقدار قرار دیا، جو اپیل کنندہ کے خلاف قتل کے مقدمے کی رجسٹریشن کی بنیاد پر معطل کیے گئے تھے۔

خلع کے حوالے سے وفاقی شرعی عدالت کا ایک اہم فیصلہ⁸⁶

محمد ذوالقرنین ایڈووکیٹ⁸⁷

حقائق:

مسماٹ نگہت یاسمین نامی مدعیہ کی جانب سے اپنے شوہر حاجی سیف الرحمان شاہین کے خلاف خلع کی بنیاد پر تین بیٹوں کا کیس ضلع جھنگ کی عائلی عدالت میں جمع کرتی ہے اور ۱۸ مئی ۲۰۲۲ء کو عائلی عدالت مدعیہ کی درخواست کو ویسٹ پاکستان فیملی کورٹس ایکٹ کے دفعہ ۱۰ [۵] کے تحت منظور کر کے مدعیہ کو خلع دے دیتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ فیصلہ بھی دیتی ہے کہ مدعیہ، مدعا علیہ یعنی اپنے شوہر کو مہر معجل کا ۲۵ فیصد حصہ ۱۰ دنوں کے اندر عطا کرے۔ عائلی عدالت کے مندرجہ بالا فیصلے کے خلاف مدعا علیہ لاہور ہائی کورٹ سے رجوع کرتا ہے لیکن لاہور ہائی کورٹ بنیادی سماعت میں ہی عائلی عدالت کے فیصلے کو برقرار رکھنے کا حکم جاری کرتی ہے اور مدعا علیہ یعنی شوہر کی اپیل کو خارج کر دیتی ہے۔

مندرجہ بالا دونوں فیصلوں کے خلاف مدعا علیہ وفاقی شرعی عدالت سے اس لئے رجوع کرتا ہے کہ عدالت نے اپنے حالیہ فیصلے⁸⁸ میں ویسٹ پاکستان فیملی کورٹس ایکٹ کے دفعہ ۱۰ [۵] کو خلاف شریعت قرار دے کر اس کو کالعدم قرار دے چکی ہوتی ہے تو مدعا علیہ کا بنیادی نکتہ یہ ہوتا ہے کہ جب کسی قانون کو ۲۰۲۲ء کو کالعدم قرار دیا جا چکا ہوتا ہے تو پھر اس قانون کی بنیاد پر ۱۸ مئی ۲۰۲۲ء کو کیسے فیصلہ دیا جا سکتا ہے۔ مدعا علیہ کی جانب سے یہ نکتہ اٹھائے جانے کے بعد وفاقی شرعی عدالت سب سے پہلے اس بات پر زور دیتی ہے کہ آئین پاکستان کے آرٹیکل ۲۰۳ [جی جی] کے تحت وفاقی شرعی عدالت کا فیصلہ نہ صرف عائلی عدالت بلکہ پاکستان کی تمام اعلیٰ عدالتوں پر بھی بانڈنگ ہے اور اسی لئے عدالت نے یہ بات صراحتاً لکھی ہے کہ تمام عدالتوں کو اپنے حدود و قیود کا خیال رکھنا چاہیے تاکہ انصاف کی فراہمی میں متضاد فیصلے رکاوٹ نہ بنیں۔ مندرجہ بالا باتوں کی وضاحت کے بعد عدالت نے اپیل کنندہ یعنی شوہر کے وکلاء کی جانب سے خلع کے خلاف دلائل اور عام معاشرے میں خلع کے

⁸⁶ یہ انتہائی اہم فیصلہ وفاقی شرعی عدالت کے عالم جج جسٹس سید محمد انور صاحب نے لکھا ہے جو کہ شریعت میٹیشن نمبر ۱۶-۱، ۲۰۲۲ء پر

وفاقی شرعی عدالت کے ویب سائٹ پر دستیاب ہے۔

⁸⁷ ریسرچ آفیسر، خیبر پختونخوا بار کونسل پشاور۔

⁸⁸ حوالہ: پی ایبل ڈی ۲۰۲۲ وفاقی شرعی عدالت ۲۵ عمران انور خان نام حکومت پنجاب

خلاف پھیلے ہوئے چند غلط تصورات کا ذکر کرنے کے بعد اپنے سامنے آسانی کے لئے مندرجہ ذیل دو سوالات رکھے جو کہ ذیل ہیں۔

2. کیا اسلام میں خلع مطلقاً عورت کا حق ہے اور خلع کے حصول کے لئے بنیادی ضروریات کیا ہیں؟
 3. کیا عورت کی جانب سے خلع مانگنے کے بعد اگر شوہر راضی نہ ہو رہا ہو تو کیا عدالت خلع دے سکتی ہے؟
- مندرجہ بالا سوالات اپنے سامنے رکھنے کے بعد عدالت نے سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۲۹ اور صحاح ستہ سے مختلف احادیث کے تفصیل کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد ان سے مندرجہ ذیل اصول وضع کئے ہیں۔

• عورت کی جانب سے عدالت سے تنسیخ نکاح کا فیصلہ طلب کرنا عورت کا بنیادی حق ہے اور اس حق سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔

• تنسیخ نکاح برزویہ خلع کے لئے عورت کا صرف یہ کہنا کافی ہے کہ وہ اپنے شوہر کو اس حد تک ناپسند کرتی ہے کہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ حدود کے اندر اپنے شوہر کے ساتھ نہیں رہ سکتی اور خلع کے لئے اس کے علاوہ کسی اور گراؤنڈ کی ضرورت نہیں ہے۔

• دوسرے نکتے میں اس بات کا اضافہ بھی کیا جائے کہ اگر عورت بدل خلع کے طور پر واپس کر دے تو عدالت کے لئے خلع کا فیصلہ دینے میں تاخیر کی گنجائش نہیں ہے۔

مندرجہ بالا باتوں کی صراحت کے ساتھ عدالت نے اس بابت مختلف اقوال کا ذکر کیا ہے کہ بدل خلع کی مقدار کیا ہوگی؟

بدل خلع کے مقدار کے حوالے سے عدالت نے سب سے پہلے حضرت عمر رض کا ایک فیصلہ ذکر کیا ہے جس کے مطابق بدل خلع مہر کی پوری رقم سے کم بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد عدالت نے حضرت علی رض کا ایک قول ذکر کیا ہے جس کے مطابق بدل خلع مہر کی رقم سے زیادہ نہ ہو۔ مندرجہ بالا اقوال سے عدالت نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بدل خلع مہر سے زیادہ نہیں ہو سکتی لیکن کم سے کم مقدار مختلف کیسز میں مختلف ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد عدالت نے اس امر پر زور دیا ہے کہ خلع میں قطعاً یہ لازمی نہیں ہے کہ عورت بہر صورت اپنا مہر مکمل طور معاف کرے گی۔ عدالت نے یہاں یہ امر بھی واضح کیا ہے کہ جب تنسیخ نکاح برزویہ خلع میں عورت کا بیان یہ ہو کہ وہ اپنے شوہر کے برے رویے کی وجہ سے خلع لے رہی ہے تو عدالت بدل خلع کی مقدار کم سے کم کرکھے گی اور اگر صورت حال شدید ہو تو عدالت طلاق بھی دے سکتی ہے اور اس صورت میں بدل خلع نہیں دیا جائے گا۔ اس کے بعد عدالت نے مختلف ائمہ کرام جن میں امام محمد ابن حسن الشیبانی، امام ابو حنیفہ اور امام کاسانی کے مختلف اقوال کا ذکر کیا ہے۔

مندرجہ بالا باتوں کی وضاحت کے بعد عدالت اپنے فیصلے عمران انور خان بنام حکومت پنجاب کی طرف واپس آئی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ اس ویسٹ پاکستان فیملی کورٹس ایکٹ کے دفعہ ۱۰ [۵] کو کالعدم قرار دینے کی وجہ یہ تھی کہ بدل خلع کی مقدار کو مقرر نہیں کیا جاسکتا اور چونکہ اس دفعہ میں بدل خلع کی مقدار مقرر کی تو اس وجہ سے اس دفعہ کو کالعدم قرار دیا گیا تھا۔ عدالت نے اس کے بعد مندرجہ ذیل نکتے کی وضاحت صراحت کے ساتھ کی ہے کہ اگر بیوی مکمل مہر واپس کر کے خلع لینا چاہے تو عدالت راضی نامے میں ناکامی کے فوراً بعد بیوی کو بغیر کسی تاخیر کے خلع کا فیصلہ دے گی لیکن اگر عورت شوہر کی جانب سے برے برتاؤ کی وجہ سے خلع کا مطالبہ کرے گی تو عدالت شہادت کے بعد بدل خلع کی مقدار کا تعین اس بات کی روشنی میں کرے گی کہ شادی کی ناکامی کس کی وجہ سے ہو رہی ہے۔

وفاقی شرعی عدالت کے اس اہم فیصلے کا خلاصہ یہ ہے کہ خلع مطلقاً عورت کا حق ہے جو کہ عورت کو قرآن و سنت نے دیا ہے اور اس حق کی وجہ سے عورت عدالت کے ذریعے اپنی مرضی سے نکاح کو ختم کر سکتی ہے اور عورت کو یہ حق حاصل کرنے کے لئے بدل خلع کے طور پر مہر کی واپسی پر رضامندی اور ساتھ ہی ساتھ یہ کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ قرآن و سنت کے مقرر کردہ حدود کے اندر نہیں رہ سکتی اور عورت کا یہ حق عدالتیں بھی عورت سے نہیں چھین سکتی۔

مندرجہ بالا امور کی صراحت کے ساتھ وضاحت کے بعد عدالت نے شوہر کی درخواست خارج کر دی۔

اگر خاوند کے حق میں حقوق زن اشوئی کا فیصلہ ہوا ہو، تو کیا بیوی دوسرا دعویٰ برائے تنسیخ نکاح دائر کر سکتی ہے؟

اسی سوال پر پشاور عدالت عالیہ یگانورہ پنچ کا ایک اہم فیصلہ⁸⁹

ذوالفقار علی ایڈووکیٹ⁹⁰

حقائق:

مسماش بیوی اپنے شوہر کے خلاف سال ۲۰۱۵ میں عائلی قوانین کے تحت مقدمہ "دعویٰ دلاپانے حق مہر وغیرہ دائر کرتی ہے جو کہ سال ۲۰۱۸ میں بیوی کے حق میں ڈگری ہوتی ہے اور شوہر کے حق میں بھی حقوق زن اشوئی کی

89 فیصلے کے مصنف جج جسٹس وقار احمد ہیں اور اسے پی ایل ڈی ۲۰۲۱ پشاور ۸۵ کے طور پر رپورٹ کیا گیا ہے۔

90 ڈسٹرکٹ بار ایبوسو ایٹشن سوات۔

ڈگری ہو جاتی ہے۔ مذکورہ ڈگری کیخلاف شوہر اپیل دائر کرتا ہے جس کو سال ۲۰۱۹ میں ایپلٹ کورٹ کچھ تبدیلیاں کر کے خارج کرتی ہے اور ابتدائی عدالت کے فیصلے کو برقرار رکھا جاتا ہے۔

اس دوران بیوی دوبارہ ابتدائی عدالت سے رجوع کرتی ہے اور ایک اور مقدمہ "دعویٰ تنسیخ نکاح ہمراہ مدعی/شوہر دائر کرتی ہے جو بیوی کے حق میں ڈگری ہو جاتی ہے، جس کے ساتھ فریقین کا نکاح ختم ہو جاتا ہے۔ اس فیصلے کو بھی شوہر چیلنج کرتا ہے مگر عدالت مرافعہ اس وجہ سے اپیل واپس کرتی ہے کہ فیملی کورٹ ایکٹ کے دفعہ ۱۴ [۲] کے تحت مذکورہ ڈگری کی خلاف اپیل نہیں ہو سکتی۔

مذکورہ آرڈر سے نالاں ہو کر شوہر پشاور عدالت عالیہ یگانورہ بیچ سے رجوع کرتا ہے اور یوں اس کیس کا آغاز عدالت عالیہ میں ہو جاتا ہے۔

عدالت کے سامنے درج ذیل دو اہم سوالات زیر بحث آئے۔

1. جب پہلے سے شوہر کے حق میں حقوق زن اشوئی کے ڈگری ہوئی ہو تو بیوی تنسیخ نکاح کا دعویٰ دائر کر سکتی ہے؟

2. کیا اس طرح کے مقدمات پر دفعہ ۱۱ مجموعہ ضابطہ دیوانی کا اطلاق ہوتا ہے؟

عدالت کے دلائل:

فریقین کے وکلاء کے دلائل سننے کے بعد عدالت اس بات سے اپنے فیصلے کا آغاز کرتی ہے کہ اسلامی قانون میں شادی ایک معاہدہ ہے اور چونکہ شوہر نے دوسری شادی کی ہے اور اس کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہا ہے اور مدعا علیہ بیوی کو اپنے بنیادی حقوق کیلئے سال ۲۰۱۵ سے مقدمات میں الجھا رہا ہے جس سے بیوی کے دل میں نفرت پیدا ہوئی ہے اور اب فریقین کا آباد ہونا مشکل ہے۔

شوہر کا موقف تھا کہ جب حقوق زن اشوئی کے ڈگری پاس ہو جائے تو تنسیخ نکاح کا دعویٰ قابل سماعت نہیں اور وہ دفعہ ۱۱ کے تحت مانع ہے۔

عدالت اس نکتے پر کہتی ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ دفعہ ۱۷ فیملی کورٹ ایکٹ کے تحت دفعہ ۱۱ کا اطلاق عائلی مقدمات پر ہوتا ہے مگر چونکہ پہلے کیس میں بیوی نے تنسیخ نہیں مانگی تھی اس لئے وہ دوبارہ تنسیخ نکاح کا دعویٰ دائر

کر سکتی ہے اور اس طرح اگر پہلے سے شوہر کی حق میں حقوق زن اثنوی کے ڈگری موجود ہو تو وہ بیوی کو دوبارہ دعویٰ دائر کرنے سے مانع نہیں رکھ سکتے۔ اس پر عدالت نے کچھ نظائر⁹¹ کا جائزہ بھی لیا۔ شوہر کا یہ بھی موقف تھا کہ اگر بیوی تنفیخ نکاح بذریعہ خلع چاہتی ہے تو وہ ادا شدہ حق مہر کے واپسی کا حقدار ہے۔ جس پر عدالت نے کہا کہ فریقین کے شادی کو ۸/۷ سال ہوئے ہیں اور فریقین کی تین بچے بھی ہے اور یہ ہر کیس میں ضروری نہیں کہ اگر بیوی خلع چاہتی ہے تو وہ ادا شدہ حق مہر واپس کرے گی اس پر عدالت نے اپنے پہلے کا تذکرہ بھی کیا۔ اور اس طرح عدالت شوہر کی طرف سے دائر نظائر⁹² کو رد درخواست خارج کرتا ہے۔ کیس کا مختصر خلاصہ کچھ یوں ہے کہ ڈگری حقوق زن اثنوی کا موجود ہونا بیوی کو دوبارہ تنفیخ نکاح کے دعویٰ دائر کرنے سے منع نہیں کر سکتی۔

عدالت عالیہ کی عائلی مقدمات میں دائرہ اختیار کے حوالے سے سپریم کورٹ کا ایک اہم فیصلہ⁹³

محمد ذوالقرنین ایڈوکیٹ⁹⁴

کیس کے حقائق:

اسانام کی ایک مدعیہ نے حماد حسن نامی مدعا علیہ کے ساتھ ۲۰۱۴ میں شادی کی جس کے نتیجے میں دوہزار پندرہ میں ان کے ہاں ایک بچے یعنی محمد عمر کی ولادت ہوئی۔ ۲۰۱۵ میں مدعیہ یعنی اسانے مدعا علیہ یعنی شوہر کے خلاف کوہاٹ کی مقامی فیملی کورٹ میں حق مہر، نان نفقہ اور سامان جہیز کی حوالگی کے لئے کیس کیا جس پر ۲۰۱۸ میں فیملی کورٹ نے مدعیہ کے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے مدعا علیہ یعنی شوہر کو پابند کیا کہ وہ مدعیہ کو تین لاکھ روپے، گھر میں آدھا حصہ اور پانچ مرلے زمین اور ۲۰۱۴ سے نان نفقہ دینے کے علاوہ محمد عمر یعنی بیٹے کو بھی سالانہ دس فیصد اضافے کے ساتھ نان نفقہ دینے کا فیصلہ کیا جس پر مدعا علیہ یعنی شوہر نے ڈسٹرکٹ کورٹ میں اپیل دائر کی جس پر ڈسٹرکٹ جج نے مدعا علیہ کے اپیل کو خارج کرتے ہوئے الٹا نان نفقہ میں سالانہ اضافہ دس کی بجائے بیس فیصد کر

91 پی ایل ڈی ۱۹۸۳/۱۱۱۹۸۳ لاہور ۲۳۲

92 پی ایل ڈی ۲۰۰۲/۱۳۶ پشاور

93 لیونوٹیو رنگ آرڈر کا یہ اہم حکم جسٹس عائشہ ملک نے لکھا ہے اور اسے سی۔ پی نمبر ۲۰۲۳/۲۱۸ کے طور پر تلاش کیا جاسکتا ہے۔

94 ایڈوکیٹ، پشاور بار ایسوسی ایشن

دیبا ڈسٹرکٹ کورٹ کے فیصلے کے خلاف شوہر نے عدالت عالیہ میں ٹرائل کورٹ اور ضلعی عدالت کے فیصلوں کی بنیاد پر آئینی درخواست جمع کی جس پر⁹⁵ میں مس ریڈنگ اور نان ریڈنگ عدالت عالیہ نے باوجود اس کے کہ شوہر کی جانب حقائق پر سوال اٹھائے گئے تھے، کیس کو نہ صرف سنا بلکہ حقائق پر فیصلہ بھی دیا لیکن مختصر ایہ کہ عدالت عالیہ نے بھی حقائق پر فیصلہ دیتے ہوئے کیس کو خارج کر دیا جس کے بعد عدالت عالیہ کے فیصلے کے خلاف حماد حسن یعنی شوہر نے سپریم کورٹ سے رجوع کیا اور یوں اس کیس کی ابتداء سپریم کورٹ میں ہوئی۔

سپریم کورٹ کے سامنے مختصر اسوال عدالت عالیہ کی جانب سے آئینی درخواست میں کیس میں حقائق کے حوالے سے سائنڈنگ دینے کا تھا یعنی کہ کیا عدالت عالیہ کسی آئینی درخواست میں حقائق کی بنیاد پر فیصلہ دے سکتی ہے یا نہیں؟

سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے کا آغاز عدالت عالیہ کو آئینی درخواستوں میں حاصل دائرہ اختیار سے کیا ہے اور اس بابت مختلف نظائر کا سہارا لے کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عدالت عالیہ کو حاصل دائرہ اختیار کا استعمال اپیل یا گمرانی کے متبادل کے طور پر نہیں کیا جاسکتا یعنی عدالت عالیہ شہادت کا دوبارہ جائزہ نہیں لے سکتی اور حقائق کی بنیاد پر فیصلہ بھی نہیں دے سکتی کیونکہ عدالت عالیہ کی مداخلت صرف استثنائی صورتوں میں ہے۔

مندرجہ بالا اصولوں کے تعین کے بعد سپریم کورٹ موجودہ کیس کی طرف واپس آئی اور یہ بات صراحت کے ساتھ کی ہے کہ چونکہ اس کیس میں بھی بنیادی سوال ٹرائل کورٹ کی حقائق کی بنیاد پر حق مہر اور نان نفقہ کی تعین پر تھا لیکن عدالت عالیہ نے غلطی سے نہ صرف اس کیس کو سنا بلکہ حقائق کے حوالے سے فیصلہ بھی دیا جو کہ یقیناً ہائی کورٹس کی دائرہ اختیار سے باہر ہے اور عدالت عالیہ کا فیصلہ بالکل ایسا ہے کہ جیسے ڈسٹرکٹ کورٹ کے فیصلے کے خلاف اپیل کا حق ہو جو کہ عدالت عالیہ کے پاس نہیں ہے۔ سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں اس کے بعد آئین پاکستان کے آرٹیکل ۱۹۹ پر ایک خوبصورت بحث کی ہے کہ اس آرٹیکل کے تحت عدالت عالیہ کو کون سے اختیارات حاصل ہیں اور کون سے نہیں ہیں اور یہ بات دوبارہ لکھی ہے کہ عدالت عالیہ ٹرائل کورٹ کی جانب سے حقائق کے تعین کے بعد اس کا دوبارہ جائزہ نہیں لے سکتی۔

سپریم کورٹ نے اس کے بعد اپیل کے حق پر ایک خوبصورت بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ اپیل کا حق قانونی حق ہے یعنی اگر کسی قانون میں اپیل کا حق ہو تو تب ہی آپ اپیل کا حق استعمال کر سکتے ہیں اور اگر اپیل کا حق ایک قانون

⁹⁵ Mis reading and non-reading.

میں نہیں ہے تو آپ کو اپیل کا حق حاصل نہیں ہے اور چونکہ عائلی قوانین میں صرف ایک ہی اپیل کا حق ہے تو اس لئے ڈسٹرکٹ کورٹ کا فیصلہ حتمی تصور ہوگا اور عدالت عالیہ کے پاس اس بات کا کوئی حق نہیں کہ وہ آئینی درخواستوں کی صورت میں فریقین کو دوسرے اپیل کا حق دیں اور وہ بھی بالخصوص فیملی کیسز میں جس میں دوسرے اپیل کا حق نہ دے کر مقننہ کی نیت بڑی واضح ہے کہ کیسز کو طول نہ دی جاسکے اور ڈسٹرکٹ کورٹ کے فیصلے کو حتمی تصور کرنا نہایت ہی ضروری اس وجہ سے ہے کہ مقدمات بروقت ختم ہو سکیں۔ مندرجہ بالا باتوں کے نتیجے کے بعد سپریم کورٹ نے حماد حسن یعنی شوہر کی اپیل کی درخواست [یوٹو اپیل] 96 خارج کر دی۔

نوٹ: سپریم کورٹ کا مندرجہ بالا فیصلہ نہایت ہی اہم ہے لیکن یاد رہے کہ بنیادی طور پر یہ ایک "لیوریٹیو زنگ" ہے اور سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلوں کے مطابق سپریم کورٹ کے لیوریٹیو زنگ آرڈر کو فیصلہ نہیں "97 آرڈر" کہا جاسکتا اور اسی وجہ سے لیوریٹیو زنگ آرڈر کو عدالتی نظیر کی حیثیت بھی حاصل نہیں ہوتی یعنی لیوریٹیو زنگ آرڈر قابل تعین نہیں ہوتا۔⁹⁸

طلاق اور خلع واقع ہونے کے اثرات اور حلالہ کے حوالے سے وفاقی شرعی عدالت کا ایک اہم فیصلہ⁹⁹

محمد ذوالقرنین ایڈووکیٹ¹⁰⁰

حقائق:

۱۲ جنوری ۲۰۰۹ کو خرم شہزاد یعنی موجودہ درخواست گزار کی شادی مدعا علیہا نمبر دو کے ساتھ شریعت محمدی کے مطابق سزا انجام پائی تھی لیکن ۴ مارچ ۲۰۲۲ کو مدعا علیہا یعنی بیوی نے عائلی عدالت کے ذریعے فیملی کورٹس ایکٹ کے دفعہ ۱۰ [۴] کو استعمال میں لاتے ہوئے خلع لے لی تھی۔ مدعا علیہا کی جانب سے خلع لینے کے بعد موجودہ درخواست گزار یعنی خرم شہزاد نے اس بنیاد پر وفاقی شرعی عدالت سے رجوع کیا کہ چونکہ خلع کے واقع ہونے کے

⁹⁶ Leave to appeal: Leave to Appeal means application for the right to file Appeal.

⁹⁷ Leave refusing order: When the court reject leave to appeal.

⁹⁸ Binding

⁹⁹ وفاقی شرعی عدالت کا یہ فیصلہ وفاقی شرعی عدالت کے عالم جج جسٹس سید محمد انور صاحب نے لکھا ہے جس کو پی ایل ڈی ۲۰۲۳ وفاقی شرعی عدالت ۲۸۶ پر دیکھا اور پڑھا جاسکتا ہے۔

¹⁰⁰ ایڈووکیٹ و ریسرچ آفیسر؛ خیبر پختونخواہر کونسل

لئے شوہر کی رضامندی لازمی ہے اور چونکہ عائلی عدالت نے شوہر کی رضامندی کے بغیر بیوی کو خلع دیا ہے جو کہ خلاف شریعت ہے تو اسی وجہ سے عدالت سے یہ استدعا کی کہ ایک توفیقیلی جج کا فیصلہ کا بعد مقرر قرار دیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ یہ استدعا بھی کی ہے کہ عائلی عدالت کے دفعہ ۱۰ [۴] کو خلاف اسلام قرار دے کر حکومت پاکستان کو یہ دفعہ اسلامی قوانین کے ساتھ ہم آہنگ یعنی مطابق کیا جائے۔ یاد رہے کہ درخواست گزار نے اپنے موقف کے حق میں سورۃ البقرہ آیت نمبر دو سو ستینیس، سنن ابن ماجہ کی حدیث نمبر دو ہزار اکیاسی، سنن نسائی کی حدیث نمبر ۳۳۶۳، سنن سعید بن منصور کی حدیث نمبر ۲۷۰۱ پر اٹھارہ کر کے عدالت کے سامنے مفصل دلائل رکھے۔

عدالت نے اپنے دلائل کا آغاز اس نکتے سے کیا ہے کہ جہاں تک فیملی کورٹس ایکٹ کے دفعہ ۱۰ [۴] کی بات ہے دے چکا ہے جس کی توفیقی شریعی عدالت کا فیل بیٹج سلیم احمد بنام حکومت پاکستان میں پہلے ہی اس بابت فیصلہ¹⁰¹ مختصر تفصیل عدالت نے اپنے فیصلے میں کچھ یوں درج کی ہے کہ خلع اور مبرات دونوں ایک طلاق بائن شمار ہوتے ہیں اور ایک طلاق بائن ہونے کی وجہ سے فریقین بغیر کسی درمیانی شادی کے دوبارہ اپنی مرضی سے نکاح کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد عدالت نے مندرجہ بالا ذکر شدہ فیصلے میں لفظ "توام" پر ہونے والی بحث درج کی ہے جس کا نتیجہ یہ نکالا ہے کہ مندرجہ بالا آیت کسی بھی صورت میں عدالتوں پر یہ قدر غن نہیں لگاتی کہ میاں بیوی کے درمیان مصالحت کی ناکامی کے بعد بھی عدالتیں خلع کا فیصلہ نہیں کریں گی کیونکہ عدالتیں پھر آخری کس لئے ہیں؟ عدالتیں فریقین کے درمیان کسی بھی قسم کی تنازعات بشمول تنبیخ نکاح وغیرہ کے حل کے لئے ہیں۔

فیملی کورٹس ایکٹ کے دفعہ ۱۰ [۴] کا قضیہ حل کرنے کے بعد عدالت نے ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے خلع واقع ہونے کے بعد اس کے قانونی اثرات کا جائزہ کچھ یوں لیا ہے کہ خلع ایک طلاق بائن شمار ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ فریقین خلع واقع ہونے کے بعد بھی آپس میں بغیر کسی درمیانی شادی حلالہ کے آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔

یہاں پر یاد رہے کہ درمیانی شادی کو عدالت نے "حلالہ" کا نام دیا ہے اور صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ حلالہ صرف اس صورت میں درکار ہوگی جب شوہر اپنی بیوی کو تیسری مرتبہ طلاق دے اور اس کے بعد عدت گزر جائے یعنی طلاق اپنی تکمیل تک پہنچ جائے اور عدالت نے اس نکتے کو خلع اور طلاق کے اثرات کے درمیان ایک قانونی فرق قرار دیا۔ یہاں پر عدالت نے ایک اور نکتے کی وضاحت بھی ہے کہ خلع واقع ہونے کے بعد اگر بیوی کسی اور سے شادی کرنا چاہے تو اس کے لئے عدت گزارنا لازمی ہے۔

¹⁰¹ بی ایل ڈی ۱۴/۲۰۱۴ وفاقی شریعی عدالت ۲۳

یہاں پر یاد رہے کہ عدالت نے خلع کو خواتین کو اسلام کی جانب سے دیا جانے والا ایک نہایت ہی ممتاز حق قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ اختیار صرف عورت کے پاس ہے کہ وہ شوہر کے ساتھ تنسیخ نکاح بزریہ خلع بھی کر سکتی ہے اور پھر اسی شوہر کے ساتھ دوبارہ اگر وہ چاہے تو بغیر کسی درمیانی شادی کے دوبارہ خود شادی بھی کر سکتی ہے اور یہ حق اس وجہ سے ممتاز ہے کہ اگر شوہر اپنی بیوی کو طلاق دے اور وہ طلاق اپنی تکمیل تک پہنچ جائے تو پھر شوہر کے پاس دوبارہ اسی عورت کے ساتھ شادی کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ عورت پہلے کسی اور کے ساتھ شادی کرے اور وہ شادی بھی عام طریقے سے ختم ہو جائے یعنی یا تو اس کا دوسرا شوہر مر جائے اور یا وہ اسے طلاق دے دے۔

مندرجہ بالا نکات کی وضاحت کے بعد عدالت نے وفاقی شرعی عدالت کے فل بینچ کے فیصلے یعنی سلیم احمد بنام حکومت پاکستان کی روشنی میں موجودہ درخواست گزار کے کیس کو خارج کر دیا۔

وفاقی شرعی عدالت کے اس فیصلے کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ خلع واقع ہونے کے بعد ایک طلاق بائن شمار ہوگی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ خلع واقع ہونے کے بعد بھی فریقین بغیر کسی درمیانی شادی کے دوبارہ آپس میں نکاح کر سکتے ہیں اور یہی وہ نکتہ ہے جو خلع کو طلاق سے ممتاز بناتا ہے کیونکہ طلاق کی صورت جب طلاق اپنی تکمیل تک پہنچ جائے تو پھر دوبارہ نکاح صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے جب بیوی کسی اور سے شادی کرے اور وہ دوسری شادی کسی نارمل طریقے سے اپنے اختتام کو پہنچ جائے تو تب ہی آپس میں شادی کی گنجائش ہے۔

پشاور ہائی کورٹ کا تینخ نکاح کے مقدمات میں راضی نامہ یعنی قبل از راست مصالحت کی ناکامی کے فوراً بعد تینخ نکاح کی ڈگری جاری کرنے کے حوالے سے ایک نہایت ہی اہم فیصلہ¹⁰²

حمزہ خان¹⁰³

بنیادی سوال:

ہائی کورٹ کے سامنے سوال یہ تھا کہ اگر فریقین کے درمیان تینخ نکاح کے مقدمہ میں حق مہر وغیرہ کے معاملات بھی زیر نزاع ہو تو ایسی صورت میں راضی نامہ ناکام ہونے کے بعد فوراً نکاح منسوخ کرنا چاہیے یا شہادت ریکارڈ کروانے کے بعد نکاح منسوخ کرنا چاہیے؟

حقائق:

مسماۃ مومنہ نے اپنے شوہر فہد سجاد کے خلاف عائلی عدالت میں ظلم و ستم کے بنیاد پر تینخ نکاح اور حق مہر و نان نفقہ وغیرہ کی وصولی کا دعویٰ دائر کیا۔ مدعا علیہ نے اپنا جواب دعویٰ جمع کیا۔ فریقین کے درمیان راضی نامہ کی ناکامی کے بعد مدعیہ نے فیملی کورٹ ایکٹ ۱۹۶۳ کے دفعہ ۱۰ [۴] کے تحت درخواست جمع کیا۔ مدعا علیہ نے جواب درخواست جمع کیا، بحث بر درخواست سماعت ہوئی اور عدالت نے حکم مصدرہ ۲۶ مارچ ۲۰۱۸ کے ذریعے درخواست مدعیہ خارج کیا۔ اسی حکم سے نالاں ہو کر مدعیہ نے پشاور ہائی کورٹ میں رٹ پٹیشن دائر کیا۔

فیصلہ:

ہائی کورٹ نے اپنے فیصلے کا آغاز اس امر سے کیا کہ ماتحت عائلی عدالت نے دفعہ ۱۰ [۴] کی درخواست خارج کرنے کی کیا وجوہات بیان کی ہیں:

مدعیہ کے موقف میں تضاد ہے۔ ایک طرف مدعیہ ظلم و ستم کی بنیاد پر تینخ نکاح کی خواہاں ہے، جبکہ دوسری طرف وہ مدعا علیہ کو حق مہر واپس کرنے سے بھی انکاری ہے جو کہ دفعہ ۱۰ [۴] کی روح کے خلاف ہے۔ مزید برآں، مدعا علیہ کی جانب سے اعادہ حقوق زن آشوبی کی درخواست بھی دائر کی گئی ہے جس کا فیصلہ شہادت ریکارڈ کرنے کے بعد کیا جائے گا۔ اس لئے اگر ابتدائی مرحلے میں ہی فریقین کا نکاح منسوخ کیا گیا تو یہ حقوق مدعا علیہ پر اثر انداز ہوگا۔

102 جسٹس سید محمد عتیق شاہ کا یہ اہم فیصلہ ۲۰۲۳ کے۔ پی۔ ایل۔ ۲۶ کی طرح پڑھا اور نقل کیا جاسکتا ہے۔

103 ایڈووکیٹ۔ ڈسٹرکٹ کورٹس ٹیمر گہرہ، دی رولویرو نیم ممبر آئین و قانون

دفعہ ۱۰ [۴] فیملی کورٹس ایکٹ ۱۹۶۴:

اگر فریقین کے درمیان راضی نامہ ناکام ہو جاتا ہے تو عدالت تفتیحات وضع کر کے شہادت ریکارڈ کرنے کے لئے تاریخ متعین کرے گی۔ خواہ کسی بھی عدالت یا ٹرائیبونل کا کوئی بھی فیصلہ ہو، عائلی عدالت راضی نامہ کی ناکامی کے بعد فوراً تینٹیج نکاح کی ڈگری جاری کرے گی اور ساتھ ہی شوہر کو حق مہر واپس کرے گی جو اس نے بوقت نکاح شوہر سے وصول کیا ہے۔

ہائی کورٹ کے سامنے سوال:

ہائی کورٹ کے سامنے اہم سوال یہ تھا کہ کیا میاں بیوی کے درمیان راضی نامہ کی ناکامی کے بعد فوری طور پر نکاح منسوخ کرنا درست ہے، جبکہ ان کے درمیان حق مہر وغیرہ کے معاملات بھی زیر نزاع ہو؟

ہائی کورٹ نے اس سوال کے جواب کے لئے عدالتی نظائر مسماۃ سائرہ ارم وغیرہ بنام طارق جاوید، ڈاکٹر فخر الدین بنام کوثر تکریم اور مسماۃ یاسمین بی بی بنام محمد غضنفر خان پر انحصار کر کے ذیل نتیجہ اخذ کیا:

تینٹیج نکاح کے کیس میں راضی نامہ کی ناکامی کے بعد عدالت کو فوری طور پر "آرڈر" کے ذریعے فریقین کا نکاح منسوخ کرنا چاہیے۔ اگر فریقین کے درمیان حق مہر وغیرہ کے معاملات زیر نزاع ہو تب بھی ان معاملات کو تینٹیج نکاح کے راستے میں حائل نہیں ہونا چاہیے۔ اگر عدالت کسی وجہ سے نکاح منسوخ نہیں کرتی تو یہ وجہ کو شوہر کے ساتھ ناپسندیدہ تعلق میں زبردستی رکھنے کے مترادف ہوگا جو کہ دفعہ ۱۰ [۴] کی روح کے خلاف ہے۔ جہاں تک حق مہر اور دیگر تنازعات کا تعلق ہے تو ان کا تعین باقاعدہ شہادت ریکارڈ کرنے کے بعد کیا جانا چاہیے۔ پس ہائی کورٹ نے مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں رٹ پیشین منظور کر کے ماتحت عدالت کا حکم منسوخ کیا، اور فریقین کے مابین تینٹیج نکاح کا حکم صادر کیا۔ نیز عدالت نے تمام فیملی اور ضلعی عدالتوں کی راہنمائی کے لئے اس فیصلے کی نقولات فراہم کرنے کی ہدایات بھی جاری کی۔

خلاصہ:

اگر تینٹیج نکاح کے کیس میں راضی نامہ یعنی مقدمے کی سماعت سے قبل مصالحت ناکام ہو جاتا ہے تو عدالت کو فوری طور پر فریقین کے مابین نکاح منسوخ کرنا چاہیے، پھلے فریقین کے درمیان حق مہر وغیرہ کے معاملات زیر نزاع کیوں نہ ہو۔ حق مہر وغیرہ کی وصولی کا حقدار زوج ہے یا زوجہ، اس امر کا تعین باقاعدہ شہادت قلم بند کرنے کے بعد کرنا چاہیے۔

بچوں کے حضانت (کسٹڈی) سے متعلق پاکستان کی عدالت عظمیٰ کا ایک دلچسپ فیصلہ¹⁰⁴

مشرف حسین فاجو¹⁰⁵

بنیادی سوالات:

کیا باپ کے زندہ ہوتے ہوئے نابالغ بچوں کی حضانت کسی اور کو دی جاسکتی ہے؟ کیا بچے کی کسٹڈی خونی رشتے کی بنیاد پر دی جائے گی یا پھر وہ کون سے عوامل ہیں، جو بچے کی کسٹڈی دیتے ہوئے عدالت مد نظر رکھتی ہے؟ ان سب سوالوں کے جوابات عدالت عظمیٰ میں دائر اس دلچسپ کیس کے تناظر میں ڈھونڈتے ہیں۔

حقائق:

کیس کچھ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ مدعی مسیحی محمد راشد (جو کہ سعودی عرب میں کام کرتا تھا)، کے تین بچے تھے۔ ۲۰۱۶ میں اس کی بیوی کو تریسیم کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اور مدعی کے بچوں کو مدعی علیہ (بچوں کا نانا) اپنی تحویل میں لے لیتا ہے۔ مدعی محمد راشد فیملی کورٹ میں بچوں کی حضانت واپس لینے کے لئے گارڈین اینڈ وارڈ ایکٹ ۱۸۹۰ء کے دفعہ ۲۵ کے تحت درخواست دائر کرتا ہے۔ ۳ ستمبر ۲۰۱۹ کو ٹرائل مکمل ہونے کے بعد، عدالت نے دفعہ ۱۹ کو بنیاد بناتے ہوئے یہ فیصلہ سناتا ہے کہ باپ اپنے بچوں کی حضانت کا ترجیحی حقدار ہے اور فیصلہ مدعی کے حق میں آتا ہے۔ اس فیصلے کے خلاف مدعی علیہ گارڈین اینڈ وارڈ ایکٹ کے دفعہ ۴ کے تحت اپیلٹ کورٹ میں اپیل درج کرتا ہے جس کا فیصلہ مدعی علیہ کے حق میں آتا ہے جبکہ مدعی اپیلٹ کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف اسلام آباد ہائی کورٹ میں اپیل کرتا ہے جس پر ہائی کورٹ نے گارڈین اینڈ وارڈ ایکٹ کے دفعہ ۱۲۵ اور ۱ کو مد نظر رکھتے ہوئے، بچوں کی فلاح و بہبود کی خاطر انکی کسٹڈی مدعی علیہ کے تحویل میں دینے کا فیصلہ برقرار رکھتی ہے۔

ہائی کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف مدعی نے سپریم کورٹ آف پاکستان میں اپیل کی۔ اس پر سماعت ہوئی مدعی کے وکیل نے عدالت کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ مدعی بچوں کا نیچرل گارڈین ہے اور بچوں کا سب سے قریبی خونی رشتہ ہونے کے ناطے ترجیحی حق رکھتا ہے اور مدعی کے ہوتے ہوئے بچے کسی اور کے تحویل میں دینے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ جبکہ مدعی علیہ کے وکیل نے اس بات پر معزز عدالت کی توجہ مبذول کرائی کہ گارڈین اینڈ وارڈ ایکٹ کو بنانے کا اصل مقصد و مبالغہ آف مانسز کو مد نظر رکھنا ہے۔ مدعی علیہ کے وکیل نے مدعی کے اس بیان کا بھی حوالہ دیا

¹⁰⁴ یہ فیصلہ جسٹس سید مظاہر علی اکبر نقوی نے تحریر کیا ہے اور اسے سپریم کورٹ آف پاکستان کی سول بیٹیشن نمبر ۱۶۶۵ آف ۲۰۲۰ کے طور پر تلاش کیا جاسکتا ہے۔

¹⁰⁵ طالب علم شریعہ و قانون بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد۔

جو فیملی کورٹ میں مدعی نے کیس کے ابتدائی مراحل میں دیا تھا۔ جس میں مدعی سے بچوں کے متعلق سوالات کئے گئے مدعی کو بچوں کے تعلیم کے بارے میں کوئی علم نہ تھا، نہ ہی یہ معلوم تھا کہ اس کے بچے کتنا سنجیدہ ہو چکے ہیں اور نہ ہی مدعی نے اپنی مرحومہ بیوی اور بچوں کو الگ خرچہ وغیرہ بھیجا تھا، ان سب باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مدعی بحیثیت باپ اپنے بچوں کے ساتھ سنجیدہ نہیں اور اپنی قانونی، شرعی اور اخلاقی ذمہ داری بخوبی انجام دینے میں ناکام ہوئے۔ جبکہ بچوں کا سارا دیکھ بھال مدعی علیہ بخوبی انجام دے رہا ہے لہذا ویلفیئر آف مائٹرز کو مد نظر رکھتے ہوئے بچوں کی حضانت مدعا علیہ کے پاس رہنے دیا جائے

اب عدالت کے پاس سوال یہ تھا کہ کیا نیچرل گارڈین کے ہوتے ہوئے نابالغ بچے کی حضانت کسی اور کو دیا جاسکتا ہے؟ کیا بچے کی حضانت طے کرتے وقت رشتے کی قربت کو مد نظر رکھا جائے گا؟ اور اگر عدالت ان سب سے بالاتر ہو کر صرف " ویلفیئر آف مائٹرز " کے اصول کو مد نظر رکھے تو کن عوامل کو مد نظر رکھے گی؟

عدالت اس نتیجے پر پہنچی کہ گارڈین اینڈ وارڈ ایکٹ کا اصل مقصد بچے کا مفاد اور ویلفیئر ہے۔ اور بچے کے گارڈین طے کرتے ہوئے بنیادی اصول تو یہی ہے کہ رشتے کی قربت کو مد نظر رکھا جائے گا اور باپ یا خونی رشتہ ترجیحی حق رکھے گا اور اس بنیادی اصول سے انحراف صرف اس صورت میں ممکن ہوگا اگر ایسا کرنا مائٹرز کے ویلفیئر میں نہ ہو۔ مطلب مخالف کونسل کو مضبوط دلائل اور وجوہات دینا ہوگا اور ثابت کرنا ہوگا کہ اس بنیادی اصول پر عمل کرنے سے بچے کا ویلفیئر یا انٹرسٹ خطرے میں ہو سکتا ہے۔ اور عدالت بچے کے ویلفیئر کو مد نظر رکھے گی نہ کہ بنیادی اصول کو۔ اس کیس میں چونکہ مدعی الیہ کے وکیل نے مدعی کے بیانات کا حوالہ دیتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ مدعی اپنے فرائض بحیثیت باپ انجام دینے میں ناکام رہا اور بچوں کا پورا دیکھ بھال مدعا علیہ کر رہا ہے لہذا عدالت ترجیحی حق کو مد نظر رکھنے کے بجائے ویلفیئر آف مائٹرز کو مد نظر رکھے گی۔

مزید یہ کہ وہ کون سے امور ہوں گے جن کو عدالت بچے کی حضانت دیتے ہوئے مد نظر رکھے گی۔ اس کا جواب معزز جج سید مظہر علی نقوی نے اپنے فیصلے میں دفعہ ۷ اگائیڈ اینڈ وارڈ ایکٹ ۱۸۹۰ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ عدالت سب سے پہلے ویلفیئر آف مائٹرز کو مد نظر رکھتے ہوئے نابالغ کی، عمر جنس مذہب حضانت لینے والے کا کردار اور، صلاحیت، نابالغ سے اس کے قربت داری، متوفی والدین کے خواہشات، اگر کوئی ہو، یہ سب امور دیکھے گی اور اگر نابالغ اس اہل ہو کہ وہ اپنا رائے دے سکے تو اس سے رائے لیا جائے گا کہ وہ کس کے ساتھ جانا چاہتا ہے؟ اس کیس میں چونکہ بچوں نے باپ کے ساتھ جانے سے انکار کیا تھا اور مدعا علیہ یعنی نانا کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی تھی۔ اس

ئے ان تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے عدالت نے مدعی کے درخواست کو خارج کیا اور ویلفیئر آف مائٹرز کے خاطر ہائی کورٹ کے فیصلے کو برقرار رکھا۔

کاپی رائٹ، مورل رائٹ، پلیمبرازم اور آرٹیفیشل انٹیلی جنس کا چیلنج

ڈاکٹر عزیز الرحمن

ڈائریکٹر، سکول آف لاء، قائد اعظم یونیورسٹی، اسلام آباد

کسی بھی شخص کی تحریر یا تخلیق کام کو اس کی اجازت یا کم از کم مصنف کی طرف منسوب کئے بغیر نقل اور شائع کرنا نہ صرف قانونی اعتبار سے غلط ہے بلکہ اس پر اخلاقی لحاظ سے بھی اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ سوشل میڈیا پر دوسروں کی تحریروں کو ان کی طرف منسوب کئے بغیر یا پھر اپنے نام سے شئیر کرنا ہمارے ہاں معمول کی کاروائی بن چکی ہے۔ اس حوالے سے چند بنیادی باتوں کو سمجھنا ضروری ہے۔

کاپی رائٹ کے قوانین کا اطلاق ہر اس تخلیقی شے پر ہوتا ہے جسے ادبی، ڈرامائی، فنکارانہ وغیرہ کہا جاسکتا ہے۔ حتیٰ کہ کمپیوٹر پروگرامز بھی کاپی رائٹ کے قوانین کے تحت قانونی تحفظ کے دائرہ کار میں آتے ہیں۔ کسی بھی کام کے کاپی رائٹ کے دائرہ کار میں آنے کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ کام بہت خاص معیار کا حامل ہے یا نہیں۔ معیار کے بجائے کام کی اصلیت اہم ہے اور اس کے لئے بھی بس اتنا ہی کافی ہے کہ کام کو تخلیق کرنے والے شخص نے اس پر اپنا کچھ ذہن، وقت یا سرمایہ صرف کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں کسی کی تحریر بالکل بنیادی یا فضول لگے مگر یہ تحریر اگر لکھنے والے کا اپنے الفاظ میں اظہار ہے تو یہ کاپی رائٹ کے زمرے میں آتا ہے۔ اگر آپ پہلے سے دستیاب ڈیٹا مثلاً ٹیلی فون ڈائریکٹری کو لے کر اسے کسی نئے فارمیٹ میں ڈھال کر مفید ڈیٹا میں بنا دیتے ہیں تو اسے اس بات سے قطع نظر کہ ڈیٹا کی تخلیق آپ کا کام نہیں ہے۔ کاپی رائٹ کے تحت تحفظ دیا جائے گا۔

یہ بات بھی یاد رہے کہ کاپی رائٹ کا اطلاق خیال کے بجائے اظہار پر ہوتا ہے۔ اس فرق کو کاپی رائٹ کے قانون کی زبان میں "آئیڈیا- ایکسپریشن ڈائکٹومی"¹⁰⁶ کہا جاتا ہے۔ اس کا سادہ الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ کاپی رائٹ کے قوانین اسی وقت حرکت میں آتے ہیں جب کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے اظہار یعنی الفاظ و بیان کو محض کاپی کر لے اور خود اسے شائع کرنا شروع کر دے۔ اگر آپ کسی کتاب یا ناول کے مرکزی خیال کو پڑھ کر اسی مرکزی

¹⁰⁶ Idea-Expression Dichotomy

خیال کے ارد گرد خود ایک ناول لکھ دیتے ہیں تو یہ کاپی رائٹ کے قوانین کی خلاف نہیں ہوگی۔ کسی کے خیال یا آئیڈیا کو چوری کرنا پبلجیٹم کے زمرے میں تو آتا ہے۔ مگر محض کسی کے خیال کو استعمال کرنے سے کاپی رائٹ کی خلاف ورزی نہیں بنتی۔

کاپی رائٹ کی خلاف ورزی اس وقت بھی ہوتی ہے اگر آپ کسی شخص کے کام کو اس کے نام کے ساتھ مگر اس کی منظوری کے بغیر شائع کرنا شروع کر دیں۔ کاپی رائٹ کے قوانین کا بڑا حصہ مصنفین و حقوق کی ملکیت رکھنے والے افراد و اداروں کے معاشی مفادات کے تحفظ سے متعلق ہے۔ سو کاپی رائٹ کے قانون کے تحت کوئی یہ کہہ کر جان نہیں چھڑوا سکتا کہ جس کام کو شائع کیا جا رہا ہے اس کے اصل مصنف یا ناشر کا نام و انتساب پوری طرح دیا گیا ہے۔ اگر آپ کی طرف سے کسی بھی طریقے سے دوسروں کے کام بغیر اجازت شائع کیا جا رہا ہے تو کاپی رائٹ کے قوانین کے تحت کاروائی کی جاسکتی ہے۔ یاد رہے کہ شائع کرنے کی اصطلاح کا مفہوم بھی وسیع تر ہے اور اس میں روایتی معنوں میں شائع کرنے یعنی ہارڈ کاپی کے ساتھ ساتھ ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کی مدد سے کام کو دستیاب کرنا بھی شامل ہے۔ سو کسی کتاب کی ڈیجیٹل کاپیاں بنا کر اسے وسیع پیمانے کا پھیلاؤ کاپی رائٹ کی خلاف ورزی ہے۔ محدود تعداد میں ایسی کاپیاں تیار کرنے کا جواز موجود ہے کہ جن کام مقصد منافع کمانا نہ ہو اور جن سے کاپی رائٹ کے مالک کی جائز کاروباری توقعات کا استحصال نہ ہوتا ہو۔

کاپی رائٹ کا حق انٹیلیکچل پراپرٹی¹⁰⁷ کی دیگر اقسام کی طرح ہمیشہ کے لئے نہیں قائم رہتا۔ کچھ استثنائی صورتوں اور تفصیلات کو چھوڑ کر کاپی رائٹ مصنف و حقوق کے مالک کی زندگی کے دوران اور اس بعد پچاس سال تک قائم رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک مصنف زندہ ہے تو اس کی زندگی کے دوران کاپی رائٹ کا حق باقی رہے گا۔ مصنف کی وفات کے بعد بھی یہ حق مصنف کے ترکہ کے طور پر پچاس سال تک باقی رہتا ہے۔ مثال کے طور پر امجد اسلام امجد کے انتقال کے بعد ان کے کام سے متعلق کاپی رائٹس کے حقوق اب ان کے ورثاء کے پاس ہوں گے اور ایسا بعد از وفات پچاس سال تک رہے گا۔ وفات کے پچاس سال کے بعد کاپی رائٹ کا حق ختم ہو جاتا ہے اور کوئی بھی شخص اس کام کو شائع کر سکتا ہے یا پھر استعمال کی دیگر صورتوں کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غالب کی شاعری اب کاپی رائٹ کے مرحلے سے گزر چکی ہے کیونکہ غالب کی وفات کو پچاس سال سے زائد عرصہ ہو چکا ہے۔

¹⁰⁷ Intellectual Property

یہاں پر دو باتیں ملحوظ خاطر رہنی چاہئیں۔ اول تو یہ کہ مصنف کے کاپی رائٹ کے حق کے خاتمے کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ کوئی دوسرا شخص اب اس تحریر یا کام کو اپنی طرف منسوب کر کے استعمال کر سکتا ہے۔ مصنف کا انتساب کا حق کاپی رائٹ کے حق سے علیحدہ بھی وجود رکھتا ہے جسے مورل رائٹ کہا جاتا ہے۔ اس بارے میں ہم آگے چل کر مزید گفتگو کریں گے۔ کاپی رائٹ کے حق کے خاتمے کا یہ مطلب ہے کہ مصنف کے نام کے ساتھ اب بلا اجازت اور رائٹی ادا کئے بغیر آپ اس کام کو شائع کر سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ایسا اوقات مصنف کے کاپی رائٹ کو فروخت کر دیا جاتا ہے اور کاپی رائٹ کا حق کسی ناشر کے پاس ہوتا ہے۔ کاپی رائٹ کی مدت ختم ہونے کے بعد بھی وہ ناشر اگر خاص ترتیب 'اہتمام ڈیزائن' وغیرہ سے کسی کتاب کو شائع کرتا ہے تو اس کے متن کا کاپی رائٹ تو ختم ہو چکا ہے مگر ناشر کا اپنا کاپی رائٹ اس ترتیب اور ڈیزائن وغیرہ کی وجہ سے وجود میں آچکا ہوتا ہے۔ سو ایسے کام کو شائع کرتے ہوئے محتاط رہنے کی ضرورت ہے کہ صرف متن کا استعمال پبلک ڈومین میں ہے ناں کہ ناشر کے اضافی حقوق بھی۔

کاپی رائٹ کے قانون کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ یہ کسی مصنف کے بنیادی کام کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اس کام کی بنیاد پر کئے جانے بہت سے ثانوی کاموں کے تحفظ کا احاطہ بھی کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی مصنف کے تحریر کردہ ناول کی بنیاد پر اگر آپ ڈرامہ یا فلم بنانا چاہتے ہیں تو آپ کو مصنف کی اجازت درکار ہوگی۔ اسی طرح اگر کسی کام کا ترجمہ کرنے کا ارادہ ہے تو بھی اجازت درکار ہوگی۔ عموماً اس قسم کی اجازت کے لئے مصنف یا کاپی رائٹ کے حق کے مالک کو رائٹی کی صورت میں ادائیگی کرنا پڑتی ہے۔ بعض صورتوں میں مصنفین مالی معاوضہ نہیں طلب کرتے مگر پھر بھی ان کی اجازت قانونی لحاظ سے ضروری ہے۔

کاپی رائٹ کے حوالے سے یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ تحریر کے اختصار یا طوالت اور فارمیٹ وغیرہ سے یہ حق ختم یا کم نہیں ہوتا۔ روایتی طور پر کتابیں، مسودات، پینٹنگز، موسیقی کی ساخت، تصاویر، پرفارمنگ آرٹ وغیرہ کاپی رائٹ کے زمرے میں آتی ہیں۔ سوشل میڈیا کے دور میں فیس بک، یوٹیوب، ٹویٹر اور اس قسم کے دیگر مواد پر کاپی رائٹ کا حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر آپ نے کسی صحت افزا مقام کی ویڈیو بنا کر اس کے بارے میں چند تعارفی الفاظ کہے ہیں تو آپ کا یہ کام کاپی رائٹ کے زمرے میں آ جاتا ہے۔ سوشل میڈیا پر بے دھڑک دوسروں کی تحریروں اور کام کو بلا اجازت استعمال کرنا درست نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ عام لوگ اس قسم کے استعمال کو روکنے کے لئے قانونی راستہ بوجہ اختیار نہیں کرتے مگر قانونی لحاظ سے یہ درست نہیں ہے۔ کسی کی تحریر کو محض منقول لکھ کر آگے چلا دینے سے بھی اس کی گنجائش نہیں نکلی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنے کام کو

شئیر کرنے کا آپشن دے رکھا ہے تو یہ اس کی طرف سے اجازت متصور ہوگی اور آپ کو یہ حق حاصل ہے کہ اس سے دوبارہ پوچھے بغیر اس کام کو اسی شخص کے نام سے شئیر کر سکتے ہیں۔

ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کے دور میں کسی کام کی کاپی بنانا بہت آسان ہو گیا ہے۔ جب آپ کوئی ڈیجیٹل کتاب یا سافٹ ویئر قیمت ادا کر کے خریدتے ہیں تو آپ یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ میں نے اس کام کو خرید لیا ہے سواب اس کے استعمال یا آگے کسی کو دینے کا حق مجھے حاصل ہے۔ اکثر اوقات یہ خرید و فروخت کا معاملہ ہوتا ہی نہیں بلکہ آپ کو اس کتاب یا سافٹ ویئر کا صرف لائسنس دیا جاتا ہے۔ یہ لائسنس مختلف نوعیت کی پیچیدہ شرائط کے ساتھ دیا گیا ہوتا ہے جنہیں ایک کلک کے ساتھ آپ قبول کر چکے ہوتے ہیں۔ ان شرائط میں یہ شامل ہوتا ہے کہ آپ اس کام کو صرف اپنی ذاتی استعمال میں لائیں گے اور منصفانہ استعمال کے اصول کے تحت ہی استعمال کریں گے۔ اس قسم کے کام کی مزید کاپیاں تیار کر کے انہیں آگے پھیلا نا قانونی طور پر درست نہیں ہے۔

مورل رائٹس کا پٹی سے جڑے ہوئے ان پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں جن کا براہ راست معاشی فوائد سے تعلق نہیں ہوتا۔ یہ ایک مصنف کے کام سے وابستہ وہ اخلاقی حقوق ہیں جنہیں مصنف سے کبھی جدا نہیں کیا جاسکتا۔ ان حقوق میں سرفہرست مصنف کا یہ حق ہے کہ اس کے کام [تصنیف، آرٹ کے شہکار وغیرہ] کو صرف اسی کی طرف منسوب کیا جائے۔ کاپی رائٹ سے مورل رائٹس کو علیحدہ سے بیان کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ کاپی رائٹ کا اصل مقصد مصنف یا حق کے مالک کے معاشی مفادات کا تحفظ ہوتا ہے۔ بسا اوقات کاپی رائٹ کا مالک اپنے اس حق کو فروخت بھی کر دیتا ہے۔ اس صورت میں مصنف کے پاس کاپی رائٹ تو نہیں رہتا مگر اس کے مورل رائٹس بعد از فروخت بھی اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔

اگر ایک شخص یا ادارہ رقم ادا کر کے کسی مصنف کے کاپی رائٹ کو خرید لیتا ہے تو اس کے بعد اب مصنف کے بجائے کاپی رائٹ کا مالک یہ خریدار بن جاتا ہے۔ مثلاً آپ نے ایک ناول لکھا اور اسے کسی ناشر کو مکمل طور پر فروخت کر دیا تو آپ کے کاپی رائٹ اب اس کام کی حد تک ختم ہو چکے ہیں۔ ناشر اس کام کو چاہے دس بار شائع کرے اور اس سے رقم کمائے، آپ اس رقم کے حقدار نہیں رہیں گے کیونکہ آپ نے شروع میں ہی اس کام کو مکمل طور پر فروخت کر دیا ہے۔ البتہ ناشر کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس کام کو اپنی طرف یا کسی دوسرے شخص کی طرف منسوب کر کے شائع کرے۔ بالفاظ دیگر مصنف کے کاپی رائٹ کے ختم ہونے کے بعد بھی اس کے مورل رائٹس باقی رہتے ہیں۔ اس مثال میں آپ کا یہ حق ہمیشہ باقی رہے گا کہ اس کام کو آپ ہی طرف منسوب کیا جائے۔ ظاہر ہے اس

انتساب کے نتیجے میں آپ کو براہ راست کوئی مالی فائدہ تو نہیں مل رہا مگر ایک اخلاقی ضابطے کی پیروی ضرور ہو رہی ہے اور یہی مورل رائٹس کی بنیاد ہے۔

مورل رائٹس میں یہ مصنف کا یہ حق بھی شامل ہے کہ اس کے کام کی سالمیت کو برقرار رکھا جائے۔ اگر کسی مصنف نے اپنے کاپی رائٹ کو فروخت بھی کر دیا ہے تو اس کے موجودہ مالک کو یہ حق حاصل نہیں ہے وہ اس کام کو اس انداز میں تبدیل کرے یا اس میں ایسے کمی بیشی کرے جو اس کام کی مجموعی شناخت و سالمیت کو متاثر کر دے۔ چونکہ ایسا کرنے سے بعض قارئین کے ذہن میں یہ احتمال پیدا ہو سکتا ہے کہ دراصل مصنف ہی نے اس انداز میں کام کو لکھا یا تشکیل دیا ہے۔ اس الجھاؤ سے بچنے اور مصنف کی شہرت کو قائم رکھنے کے لئے مورل رائٹس کے اس پہلو کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔

یاد رہے کہ کاپی رائٹ کے برعکس مورل رائٹس کے بارے میں کامن لاء اور سول لاء کی روایات کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ سول لاء کی روایت کے حامل ممالک میں مورل رائٹس کو ہمیشہ سے بہت سنجیدگی اور اہتمام سے لیا جاتا رہا ہے۔ اس کے برعکس کامن لاء کے ملکوں - امریکہ و برطانیہ - میں تاریخی طور پر مورل رائٹس کے بجائے کاپی رائٹ کے تحفظ پر زور دیا جاتا رہا ہے۔ گو کہ بین الاقوامی سطح پر انٹیلیکچوئل پراپرٹی کے قوانین کے معاہدات کے وجود میں آنے سے اس خلیج کو پائے میں مدد ملی ہے اور برن کنونشن [جیسے معاہدات، جس کا ایک ممبر پاکستان بھی ہے] میں مورل رائٹس سے متعلقہ دفعات کو شامل کیا گیا ہے۔ ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے زیر انتظام ہونے والے انٹیلیکچوئل پراپرٹی کے سب سے اہم معاہدے ٹریپس معاہدہ میں البتہ مورل رائٹس کو باقاعدہ شامل نہیں کیا گیا کیونکہ یہ معاملہ کاپی رائٹ کے صرف ان پہلوؤں کا احاطہ کئے ہوئے ہے جن کا تعلق تجارتی امور سے ہے۔ اس معاہدے میں مورل رائٹس کو شامل کرنے کی مخالفت امریکہ نے بھرپور انداز میں کی تھی۔

ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کے دور میں مورل رائٹس کی اہمیت پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے۔ آن لائن پلیٹ فارمز پر بہت سا مواد ایسا ہے جس کے مصنفین مالی فائدے کے حصول میں دلچسپی نہیں رکھتے مگر وہ یہ دلچسپی ضرور رکھتے ہیں کہ ان کے کام کو ان ہی کی طرف منسوب کیا جائے۔ نیز اس کام میں کسی قسم کی تبدیلی کی اجازت نہیں دی جاتی یا تبدیلی کو اجازت سے مشروط کیا جاتا ہے۔ آج کل اس کام کے لئے کریڈیٹ کا منتر کے تحت لائسنس دیئے جاتے ہیں جس کی اصل بنیاد مورل رائٹس ہی ہیں۔ ہمارے ہاں یہ عام چلن ہے کہ سوشل میڈیا پر دوسروں کی تحریروں کو لوگ اپنے ناموں سے شائع کر دیتے ہیں۔ یہ محض پلیجرم ازم یا سرقت نہیں ہے بلکہ مصنف کے مورل رائٹس کی خلاف ورزی بھی ہے۔ بسا اوقات لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے دوسرے کی تحریر کو کچھ تبدیلیوں کے ساتھ اپنے

نام سے شائع کیا ہے۔ یہ بھی مصنف کے مورل رائٹس کی خلاف ورزی ہے کیونکہ اس سے مصنف کے کام کی سالمیت متاثر ہوتی ہے۔

اس ضمن میں ایک اہم بات قدیم مصنفین کی کتابوں کی تحقیق اور تخریج سے متعلق ہے۔ کچھ عرصے سے یہ رواج چل پڑا ہے کہ نامور مصنفین کی کتب کو تخریج و تحقیق کے نام پر قطع و برید کر کے شائع کیا جاتا ہے۔ تراش کی کتابوں کی تخریج اور تحقیق اپنی جگہ بہت اہم اور مفید کام ہے مگر اس کو شائع کرتے ہوئے یہ اہتمام کرنے کی ضرورت ہے مصنف کا اصل متن اپنی جگہ پر قائم رہے اور تخریج و تحقیق کو حاشیہ میں مناسب ترتیب کے ساتھ شائع کیا جائے۔ یہ رجحان مورل رائٹس کی خلاف ورزی ہے کہ اصل مصنف کے متن کو ہی کاٹ کر اس میں سے کچھ چیزوں کو نکال دیا جائے اور باقی کتاب کو شائع کر دیا جائے۔ یاد رہے کہ مورل رائٹس، کاپی رائٹ کے برعکس وقت کے ساتھ ختم نہیں ہوتے سو یہ سہولت بھی حاصل نہیں ہے کہ محققین و ناشرین صدیوں پرانے کام کے ساتھ جو مرضی سلوک کریں۔

پلیجرم ازم یا سرتہ کسی کی تحریر، خیال یا کام کو اپنا بنا کر پیش کرنے کا نام ہے۔ اس عمل کو ایک اخلاقی جرم مانا جاتا ہے اور بسا اوقات پلیجرم ازم اور کاپی رائٹ کی خلاف ورزی ایک ہی عمل کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اگر کسی مصنف کی تحریر کو کوئی شخص من و عن نقل کر کے اپنے نام سے شائع کرتا ہے تو یہ پلیجرم ازم بھی ہے اور کاپی رائٹ کی خلاف ورزی بھی۔ اس صورت میں کاپی رائٹ کی خلاف ورزی پر تو قانونی کارروائی کی جاسکتی ہے مگر سرتہ یا پلیجرم ازم کرنے پر کسی خاص قانون کے تحت گرفت کرنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ پلیجرم ازم کرنے کی پاداش میں انتظامی نوعیت کی سزائیں یا اقدامات کئے جاتے ہیں۔ مثلاً پاکستان میں ہائیر ایجوکیشن کمیشن نے پلیجرم ازم پالیسی بنا رکھی ہے جسے لاگو کرنا ملک بھر کی جامعات پر لازم قرار دیا گیا ہے۔ اس پالیسی کے تحت اگر پلیجرم ازم کا کوئی کیس ثابت ہو جائے تو مختلف انتظامی نوعیت کی سزائیں مثلاً ڈگری کا منسوخ کرنا، نوکری سے وابستہ فوائد کا قنصل یا بعض انتہائی صورتوں میں نوکری سے فارغ کرنے جیسے اقدامات بھی شامل ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ پلیجرم ازم کو کسی قانون کے تحت جرم نہیں بنایا گیا تو اس سے یہی مراد ہوتا ہے کہ ملکی سطح پر کوئی مخصوص قانون اس جرم کی تعریف اور سزا کا تعین نہیں کرتا۔ یہ معاملہ انتظامی نوعیت کی تادیبی کارروائی کے زمرے میں آتا ہے۔

پلیجرم ازم کے بارے میں سب سے بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ کسی کی تحریر یا کام کو من و عن نقل کرنا ہی پلیجرم ازم ہے۔ حالانکہ سب سے سنگین نوعیت کا پلیجرم ازم کسی شخص کے خیالات کو اپنا بنا کر پیش کرنا ہے۔ اگر آپ نے کسی کانفرنس یا مقالہ میں کسی شخص کے تحریر کردہ اچھوتے خیال کو سن یا پڑھ کر اسے اپنے الفاظ میں تحریر کیا مگر یہ

نہیں بتایا کہ یہ آئیڈیا کہاں سے لیا گیا ہے تو یہ اول درجے کا سنگین پلیمجرم ازم ہے۔ کاپی رائٹ اور پلیمجرم ازم کا فرق بھی اس نکتے کی صورت میں بیان ہو سکتا ہے۔ کاپی رائٹ کا تعلق کسی کام کے ایکپریشن سے ہوتا ہے اور اس کے تصور اور خیال کو کاپی رائٹ کے تحت تحفظ حاصل نہیں ہوتا۔ تاریخی ناولوں یا ڈراموں کے پس منظر میں ایک ہی آئیڈیا کارفرما ہوتا ہے اور بہت سے مصنفین اس خیال کو اپنے الفاظ میں تحریر کرتے ہیں۔ یہ خیال پبلک ڈومین میں ہوتا ہے سوائے کاپی رائٹ کے قانون کے تحت تحفظ نہیں حاصل مگر ہر مصنف کی تحریر کردہ کہانی اس کے ساتھ خاص ہے اور اسے کاپی رائٹ کے تحت تحفظ حاصل ہے۔ اگر کوئی آئیڈیا پہلے سے پبلک ڈومین میں نہ ہو اور اسے کوئی مصنف پہلی بار موضوع تحریر بنائے اور بعد ازاں دوسرا مصنف اسی آئیڈیا کو پہلے مصنف کی طرف منسوب کئے بغیر اپنے انداز میں تحریر کر دے تو اس سے کاپی رائٹ کی خلاف ورزی تو نہیں ہوتی، مگر پلیمجرم ازم کا ارتکاب ضرور ہو جاتا ہے۔

پاکستانی جامعات میں ایچ ای سی کی طرف سے فراہم کردہ سافٹ ویئر کے ذریعے پلیمجرم ازم کو چیک کرنے کے رجحان سے بھی بہت ساری خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ایک تو یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اس سافٹ ویئر [ٹرنینٹ] میں پلیمجرم ازم چیک کرنے کے لئے جو کم از کم شرح، مثلاً ۱۹ فیصد، مقرر کی گئی وہ قابل قبول ہے اور پلیمجرم ازم بس وہی ہو گا جو اس شرح سے زیادہ ہے۔ یہ ایک غلط سوچ اور تصور ہے۔ پلیمجرم ازم ایک غلط اور غیر اخلاقی کام ہے چاہے اس کی شرح بہت کم ہی کیوں نہ ہو۔ ہمارے ہاں متداول سافٹ ویئر دراصل امریکی جامعات میں طلباء کی اسائنمنٹس کو چیک کرنے کے لئے بنایا گیا تھا اور یہ سافٹ ویئر مماثلت کو جانچنے کا ایک طریقہ ہے۔ مختلف قسم کی ریسرچ میں اصطلاحات اور ذرائع مشترک ہوتے ہیں اور انہیں مماثلت کے باوجود ایک حد تک پریسیرچ اسائنمنٹ میں قابل قبول گردانا جاتا ہے اور اسی کے لئے ہمارے ہاں ۱۹ فیصد کی شرح مقرر کی گئی ہے۔ اگر کسی مقالہ کے متن میں ۱۸ فیصد من و عن نقل نکل آئے اور اس کا کوئی حوالہ بھی نہ ہو تو اسے پلیمجرم ازم ہی سمجھا جائے گا۔ ہمارے ہاں اس حوالے سے ایک میکانیکی سوچ پیدا ہو گئی ہے اور پلیمجرم ازم کو محض ایک نمبر کے گروگھوما کر دیکھا جاتا ہے جو بالکل غلط روش ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ مذکورہ سافٹ ویئر سب سے سنگین نوعیت کے پلیمجرم ازم یعنی آئیڈیا کی نقل کو تو پکڑ نہیں سکتا سوائے ہمارے ہاں سرے سے پلیمجرم ازم سمجھ ہی نہیں جاتا۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ جب کوئی محقق یا استاد کسی مقالے میں موجود سرقہ کی نشاندہی کرتا ہے تو جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی [ٹرنینٹ] کی رپورٹ تو ۱۹ فیصد

سے کم ہے سو آپ کون ہوتے ہیں اسے پلینجرم ازم کہنے والے! یہ بالکل ہی جہالت پر مبنی توجیہ ہے جس کے بارے میں آگاہی کی ضرورت ہے۔

سوشل میڈیا اور آرٹیفیشل انٹیلی جنس کے دور میں پلینجرم ازم کا مسئلہ بہت زیادہ سنگینی سے سامنے آرہا ہے۔ سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر یہ معمول کی بات بنتی جا رہی ہے کہ لوگ دوسروں کی تحریر یا گفتگو کو سن کر انہیں اپنی تحریر و گفتگو کے ذریعے ایسے پیش کرتے ہیں کہ گویا کہ یہ ان کے اپنے خیالات ہیں۔ چیٹ جی پی ٹی اور اس قسم کے دوسرے ٹولز کے ساتھ دو مسائل جڑے ہوئے ہیں۔ لوگ ان کے استعمال سے معلومات حاصل کرتے ہیں اور پھر انہیں اپنا بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ سنجیدہ مسئلہ یہ ہے کہ چیٹ جی پی ٹی کی طرح کے ٹولز خود بھی پلینجرم ازم کے بھرپور مرتکب ہوتے ہیں۔ مختلف جگہوں پر موجود معلومات کو یہ ٹولز اس طرح پیش کر دیتے ہیں بے تحاشا خلاف ورزیوں کے الزامات بھی عائد کئے ہیں۔